ذکرِ حسینؑ

جلد دوئم

پروفیسر کرار حسین

جلد دوم

پروفیسر کرار حسین

اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ سینٹر

ایس ۔ ٹی B/1 بلاک ۶ ۔ فیڈرل بی ایریا کراچی

تعاون

SANA (NEW JERSEY CHAPTER)

U.S.A

ان دس خطبات کا مجموعہ جو
پروفیسر کرار حسین صاحب نے
نومبر ۱۹۸۰ء میں 'SANA' کی
دعوت پر امریکہ میں ارشاد
فرمائے!

(مشہور آفسٹ پریس کراچی ۱)

پیش لفظ

میری بساط سے باہر ہے کہ میں ان بصیرت افروز خطبات پر کوئی تنقید و تبصرہ کر سکوں۔
لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ صلح حسنؑ کے متعلق جو شکوک اور شبہات تھے جن سے خود
امامِ مظلوم کے بہت سے رفقا نہ بچ سکے وہ ان خطبات کے پڑھنے کے بعد رفع ہو گئے
معتقدات کے شکنجہ میں لا کر اور یہ کہہ کر فعلِ معصوم تھا امام حسن علیہ السلام کو ماننے والوں
کی زبان بند کر دینا بہت آسان ہے لیکن عقل کے ناخن سے شبہات کی گتھیوں کو سلجھا
کر دلوں کو مطمئن کر دینا بہت مشکل ہے۔

ہر کارے و ہر مردے

میں پروفیسر صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ان خطبات کا انگریزی میں ترجمہ کرنے
کا شرف مجھ کو بخشا۔

بندۂ احقر
مقبول حسین منیر

اس کتاب کا مسودہ تالیف ہو چکا تھا اور ہم اس کی طباعت کی تدبیر کر رہے تھے اور
مقبول صاحب اس کے انگریزی ترجمہ کی تیاری کر رہے تھے کہ مقبول صاحب ہم سے
جدا ہو کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مقبول صاحب ہمارے بہت قابلِ قدر اور
باوفا شریکِ کار تھے۔ وہ صاحبِ ایمان تھے۔ اور ان میں ایمان کی جرأت
تھی۔ ہم کیا کہیں ایسے لوگ اس زمانے میں کہاں ہوتے ہیں۔ خدا ان
کی مغفرت کرے اور ہماری بھی۔

کرار حسین

پہلی مجلس

تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو مالک الملک ہے۔ خلق اسی کے لیے ہے۔ امر اسی کے لیے ہے۔ اسی نے ہر شے کو پیدا کیا۔ اسی کا حکم کارفرما ہے اس نے مکان کو پیدا کیا۔ اس نے زمان کو پیدا کیا۔ اس نے وقت کو پیدا کیا وہ لوگوں کے درمیان زمانے کو پھیرتا رہتا ہے۔ آج ایک قوم کو عروج ہے۔ کل دوسری قوم کو عروج ہے۔ اسی طریقے سے عروج و زوال کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ہر روز اللہ تعالیٰ ایک نئی شان سے ظاہر ہوتا ہے۔ گویا زمانے کے انقلاب میں اللہ کی بڑی نشانیاں ہیں۔ جس طرح فطرت میں اللہ کی نشانیاں ہیں اسی طرح انسان کے نفس میں بھی اس کی نشانیاں ہیں۔ ایام کے بدلنے میں قوموں کے عروج و زوال میں، زمانے کے حادثات میں اللہ تعالیٰ نے بڑی عبرت خیز نشانیاں رکھی ہیں۔

درود ہو ہمارا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر جس کے طفیل اور جس کی کوششوں سے اسی ہر دم متغیر ہوتے ہوئے زمانے میں صراط مستقیم کی وضاحت ہوئی اور زندگی کا سیدھا راستہ بتایا گیا۔

اور ہمارا اسلام ہو ان ائمہ اطہار پر جنھوں نے زمانے کی مختلف کروٹوں میں زمانے کی تبدیلیوں میں۔ زمانے کے انقلابات میں صراط مستقیم کی وضاحت کرتے رہے۔ صراط مستقیم پر چلتے رہے اور زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ

باوجود بے پناہ مشکلات کے ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لرزش نہ آنے پائی۔ وہ زمانہ بھی تھا جب اسلام شروع ہوا تھا۔ وہ زمانہ بھی تھا جب حضورؐ سرورِ کائنات کو حکومت حاصل تھی اور ایک زمانہ وہ تھا جب اہل بیتؑ محمدؐ کو ایک پالیسی کے تحت نظر انداز کیا جاتا تھا۔ ان کی تحقیر کی جاتی تھی۔ وہ زمانہ بھی تھا جب امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کی تھی۔ وہ زمانہ بھی تھا جو کچھ کربلا میں گزرا۔ اس کے بعد ائمہؑ کے زمانے آئے حکومتیں آئیں، حکومتیں بدلیں اور ان کے تمام زمانوں کے تغیرات اور تبدیلیوں میں ہمارا اسلام ہوا ان ذوات مقدسہ ائمہ اطہار پر جو صراطِ مستقیم پر ایسے چلے کہ خود صراطِ مستقیم ہو گئے۔ اور آج کے دن ہمارا اسلام ہو خاص طور پر شہیدوں کے اس سید و سردار پر اس پر کہ جس وقت یہ راستے دھندلا چکے تھے۔ دینِ حق پر غفلت کے پردے ڈالے جا چکے تھے۔ ظلم کے پردے ڈالے جا چکے تھے۔ ایسے میں اس شہیدوں کے سردار نے اپنا خون دے کر دینِ حق کی کشتی کو سنبھالا۔

آج ہمارے مطلع، ہمارے افق پر دینِ حق نمودار ہوا ہے اور ۶۱ھ میں جب یہی چاند طلوع ہوا تھا تو اس نے ایک قافلے کو دیکھا تھا جو اپنی منزل سے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔ بڑی منزلیں طے کرتا ہوا یہ قافلہ وہاں تک پہنچا تھا۔ ایک خوف کا ماحول تھا۔ چاروں طرف سے فوجیں راستہ روکنے کے لیے چلی آ رہی تھیں اور اس طرف تھوڑے سے آدمی تھے جن میں کچھ بوڑھے تھے۔ کچھ جوان تھے۔ کچھ بچے تھے اور کچھ عورتیں تھیں۔ ان میں تیں وہ لوگ بھی تھے جو مدینہ سے ساتھ آئے تھے۔ کچھ سعادت مند وہ بھی تھے جو راستہ سے ساتھ ہو لیے تھے اور اب یہ قافلہ اس جگہ پہنچ گیا تھا۔

جہاں تاریخ کی حق و باطل کی سب سے بڑی جنگ ہونا تھی اور سب سے بڑا فیصلہ ہونا تھا وہ ۶۱ھ میں ہونا تھا۔ اور اب زمانہ بہت تیزی کے ساتھ انقلابات سے گزرتا ہوا پندرھویں صدی میں داخل ہو گیا ہے۔ اس زمانے سے لے کر آج تک جب یہ چاند نمودار ہوا ہے تو اس نے کچھ یادیں تازہ کی ہیں۔ کچھ لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ کچھ بھولی ہوئی حقیقتیں یاد آئی ہیں۔ کچھ اپنی زندگی کے مشاغل سے ہٹ کر انسان نے زندگی کی ابدی حقیقتوں کو سوچا ہے اور کس طرح سے۔ کس حالت میں ماہ محرم کی یہ یاد شروع ہوئی ہے۔ ذرا اس پر غور کیجئے وہ زمانہ وہ تھا جب حضرت علیؑ ابن ابیطالب کا نام لینا ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے یوں سمجھئے کہ باطل کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اسلام کی بدلی ہوئی تصویر پیش کی جارہی تھی۔ ایسا اسلام پیش کیا جارہا تھا اور (حالانکہ باطل کی بنیادیں کبھی نہیں جمتیں) ایسے اسلام کی بنیادیں اس وقت تک جم نہیں سکتی تھیں جب تک حقیقی اسلام لوگوں لوگوں کے دلوں سے محو نہ کیا جائے اور حقیقی اسلام کو اس طرح نہ پیش کیا جائے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائے۔ یہ امیر المومنین علیؑ کی شان تھی کہ ان کی ذاتؑ حقیقی اسلام کا نشان بنی ہوئی تھی اور ظالموں نے اس بات کی کوشش کی کہ حقیقی اسلام مٹ جائے اور باطل کی تفسیر اسلام قرار پا جائے تو ان کو اس سے زیادہ موثر بات کوئی نظر نہ آئی کہ منبروں پر حضرت علیؑ کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے جائیں اور ان کی برائی کی جائے تو یہ وہ زمانہ تھا جب مجلس عزا قائم کرنا۔ امام حسینؑ کا ذکر کرنا حکومت سے بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ذرا غور کیجیے ایسا کیوں تھا۔ کیوں علیؑ کا نام لینا جرم تھا۔ کیوں مجلس عزا اور ذکر حسینؑ بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ کیوں یہ بات تھی کہ ہمارے

آئمہ جنھوں نے کبھی نہ حکومت کا دعویٰ کیا نہ حکومت کرنا چاہا۔ وہ جو اپنے گھروں میں دین حق کی شمع روشن کیے بیٹھے تھے کیوں ان پر ظلم کیے گئے۔ کیوں ان کو قید خانوں میں ڈالا گیا۔ کیوں ہمارے نشانات مٹائے جاتے رہے۔ کیوں جناب علیؑ مرتضیٰ کی قبر چھپ کر بنائی گئی۔ کیوں کربلائے معلیٰ کو زمین کی سطح کے برابر کر دیا گیا۔ کیوں اس بات کی کوشش کی گئی کہ نہر کا پانی وہاں تک آجائے قبریں ڈوب جائیں۔ آخر ان نشانوں کو مٹانے کی کیوں کوشش کی گئی۔ اور ہماری زندگی کی کیا خصوصیت تھی۔ ہمارا کیا آئیڈیل تھا۔ کیا مقصد تھا جس کی پاداش میں بغداد میں جب کوئی شاہی محل بنتا تھا تو اس کے گارے میں سادات کا خون صدقہ کے طور پر شامل کیا جاتا تھا تو اس پس منظر اور تاریخ کے ساتھ ہم اس نام کو یاد کرتے ہیں اور اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ خواہ ہم تنہا ہوں یا ساتھیوں کے ساتھ ہوں جب یہ چاند نظر آیا تو ہائے حسینؑ کہا اور سینہ پر ہاتھ چلا گیا۔

عزیز دکربلا ایک واقعہ کا نام نہیں۔ کربلا اسلام کی روایت ہے۔ یہ اسلام کی حقیقت ہے۔ یہ ہمارا سنہری دور ہے۔ یہ آئمہ کا دور ہے۔ دوسری قوموں کا دور حکومتوں کا دور ہوگا۔ مگر ہمارا وہ دور ہے جس میں حق کی خاطر مظلومیت کی کڑی منزلیں طے کی گئیں۔ ہماری زندگی کی روایت یہ ہے کہ ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے مظلوموں نے حق کا جھنڈا بلند رکھا۔ اور ہر قسم کی مخالفتیں اور تکلیفیں برداشت کیں اور ان کا مقابلہ کیا۔ اور سب مشکلات کے باوجود اسلام کو دل سے لگائے رکھا اور ہم نے ان کی یاد کو دل سے لگائے رکھا۔ اس لیے کہ یہ یاد اس اسلام کی علامت ہے جس سے حکمت کے سرچشمے پھوٹے۔ اسلام کی تاریخ کو دیکھو۔ چاہے علم کی کوئی شاخ ہو۔ کوئی قسم

ہو اس کا کسی نہ کسی امام سے تعلق ضرور ملے گا۔ وابستگی ملے گی۔ یہیں سے تصوف کے راستے پھوٹے یہیں سے حکمت کے اور یہیں سے تمام علوم کے راستے نکلے اور وہ بھی اس حالت میں جب اتنی سب مشکلات اور تکلیفات کا ہر دم مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ تو یہ ہماری تاریخ ہے اور اس روایت کو ہم نے قایم رکھا۔ اس کو رسم نہیں بنایا۔ یہ روایت ہماری زندگی کا مرکز رہی۔ اسلام کی ایک علامت بنی۔ اس روایت کے ذریعہ اسلام کی معرفت حاصل کی اس لیے کہ ہمارے دو ہی علامت ہیں۔ ایک عرفان الٰہی حاصل کرنا اور وہ بھی ائمہ کی مودت کے ذریعہ۔ اسی رونے کے ذریعہ۔ اگر یہ رونا رسم نہیں ہے تو یہ رونا تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے۔ یہ رونا ایک communion ہے۔ ایک تعلق پیدا کرنا ہے۔ ایک گروہ سے اپنے اماموں سے اپنے رہبروں سے۔ تو یہ روایت چلتی رہی کہ یہ یاد ہماری زندگی کا محور بنتی رہی اور ہم تمام ملّتِ محمدی کی رہبری کرتے رہے۔ علم کے معاملہ میں۔ حکمت اور تقویٰ کے معاملہ میں اور ہمارا دوسرا شعار یہ ہے کہ ایک طرف عرفان الٰہی ہو اور دوسری طرف ظلم کی مخالفت جس طرح بھی ہو سکے جس رنگ میں بھی ہو سکے اور جس پہلو سے بھی ممکن ہو۔ یہی دو شعار شیعیت کی نشانی ہیں یعنی محبت کا دین مودت کا دین۔ کچھ ہستیوں کے دامن پکڑنے کا دین۔ یہ وہ دین ہے جو عرفان الٰہی کا دین ہے اور دوسری طرف ظلم کی مخالفت کیونکہ اصول دین میں عدل لازمی ہے۔ یہی دو باتیں ہم کو ائمہ سے پہنچی ہیں اور یہی شیعیت ہے اور اسی عرفان الٰہی میں حصول علم حاصل کرنا شامل ہے۔

آج امت مسلمہ بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ معلوم نہیں مستقبل میں کیا ہے دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں یا تو ان کا مستقبل بہت شاندار ہے یا یہ آخری

کشمکش ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم تاریخ کے اہم موڑ پر کھڑے ہیں اور اس میں شیعہ ایک خاص کردار ادا کر رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اقوام عالم میں مسلمانوں کا ایک مقام ہوتا ہے اور امت محمدیؐ میں شیعوں کا کیا مقام ہوتا ہے۔

آج ایک اجنبی دیس اور اجنبی ماحول میں ہم سب ایک روایت کو تازہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ذکر حسینؑ کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ یہ ذکر جب تک ہماری زندگی سے متصل نہیں ہوتا۔ جب تک ہماری زندگی کا حصہ نہیں بنتا۔ اس وقت تک یہ محض ایک دکھاوا اور رسم رہتا ہے اور ایک بات بہت افسوس کی ہے۔

مجھے معلوم نہیں یہاں کیا مسائل ہیں کیا پرابلم ہیں اور یہاں کس طرح رہ کر اپنا مقام پیدا کرنا ہے۔ مگر اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ ماحول بہت اجنبی سا ہے قدریں مختلف ہیں۔ زندگی کے طریقے مختلف ہیں اور ہمارے بچے بھی اسی ماحول میں تعلیم پا رہے ہیں، پرورش پا رہے ہیں۔ شاید آپ لوگوں کے دماغوں میں بھی یہ مسائل آتے ہوں گے۔ اصل میں ہجرت ہماری تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ ہجرت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہماری تاریخ میں ہجرت کا خاص مقام ہے۔ اس کی علامت حضورؐ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا ہے۔ امام حسینؑ کا مدینہ سے کربلا کی جانب ہجرت کرنا ہجرتیں ہمارے یہاں ہوتی رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کا ہر لمحہ زنبش کیا گیا۔ اسلام عرب سے نکل کر ایران پہنچا۔ ہر جگہ اسلامی تہذیب کے نئے نمونے پیش ہوئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ہم جس ملک میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ ایک عظیم تہذیب کا علم بردار ہے اور اس سے ہم لوگوں کے ذہنوں پر ایک مرعوبیت کی کیفیت پیدا ہونا ایک فطری

عمل ہے لیکن حقیقت کو نظر انداز کرنے سے اس کا حل کبھی نہیں نکلا کرتا
اس مرعوبیت کا ردعمل مختلف صورتوں میں عیاں ہوتا ہے کبھی تو یہ ہوتا
ہے کہ انسان اسی میں گھل مل جانے کی کوشش کرتا ہے جو ایک ناممکن کوشش
ہے یا پھر دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس اجنبی معاشرہ اور تہذیب
کے ہر پہلو پر تنقید کرنا شروع کر دیتا ہے بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہر تہذیب میں
کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں اور کچھ خراب۔ آخر اس مقام تک اگر کوئی تہذیب
پہنچی ہے تو اس میں کوئی تو اچھی بات ہوگی۔ ایک ردعمل یہ ہوتا ہے کہ انسان
اپنے ماضی کو Romanticise کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پدرم سلطان
بود والی بات ہے۔ یعنی یہ خیال کہ اگر سائنس میں یہاں والے بڑھتے ہوئے
ہیں تو کیا ہوا کیمسٹری ہم نے ایجاد کی۔ الجبرا ہم نے شروع کیا۔ وغیرہ وغیرہ اور
نتیجہ یہ نکالیں کہ ہم کو مزید جستجو کی کیا ضرورت جبکہ ہمارے آباؤ اجداد ان کے
موجد تھے لیکن یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ آپ کے بزرگوں میں کسی نے کچھ ایجاد
کیا تھا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت آپ خود کیا ہیں اور اگر مسلمانوں
کی آپ تاریخ دیکھیں اور مسلمانوں کے کلچر کو دیکھیں تو اس میں جو بہت زبردست
بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مختلف علوم خواہ وہ یونان کے ہوں۔
ہندوستان کے ہوں۔ چین کے ہوں مسلمانوں نے سب کو حاصل کر کے
اپنایا اور ان کو اپنی روایات کا ایک حصہ بنایا۔ زندگی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے
کہ وہ اپنے ماحول سے نشوونما کی تمام صلاحیت حاصل کرتا ہے اور اپنے
کو فروغ دیتا ہے۔ وہ زندگی کی لچک ضروری ہے ہم کو دیکھنا ہے کہ ہم میں یہ
خصوصیت موجود ہے یا نہیں۔

ہم ایک طریقۂ ہدایت کے ماننے والے ہیں جس کو امت کہتے ہیں۔

امامت محض چند اسمائے مبارک نہیں ہیں بلکہ یہ ایک فلسفۂ زندگی ہے ایک مسئلہ امامت ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کو ماننے والے ہمیشہ تنظیم کے ساتھ رہیں گے اور اس تنظیم کی بنیاد ان کا دین ہے۔ ہمارے معاشرے میں تنظیم ہے خواہ ہماری تعداد کم ہو یا زیادہ اس لیے کہ جماعت کم یا زیادہ پر منحصر نہیں ہے اگر دو آدمی بھی ہوں ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرنا ضروری ہے۔ امامت کو اصول دین ماننے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جہاں امامی لوگ رہیں گے تنظیم کے ساتھ رہیں گے۔ اگر ہم میں باہمی انتشار ہے اور ہم تنظیم کو برقرار نہیں رکھ سکتے تو ہم کو کوئی حق نہیں کہ امامت کو اصول دین میں شامل رکھیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم فقہ بنانے والے ہیں۔ حضرت علیؑ سے کچھ لوگوں نے عرض کی کہ یا امیرالمومنین یہ خارجی لوگ آپ کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں کیوں اعلان نہیں کرتے کہ یہ لوگ اسلام سے خارج ہیں۔ مولیٰ نے جواب دیا کہ میں مسلمانوں کا امام ہوں۔ میرا کام ہے کہ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دوں لوگوں کو اسلام کی طرف بلاؤں۔ میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ جو لوگ پڑھے ہیں ان کو اسلام سے خارج کردوں۔ صحیفہ کاملہ دعاؤں کی ایک کتاب ہے۔ اس میں آپ دیکھیں کہ اللہ کا ایک بندہ اپنے پیدا کرنے والے سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہے۔ یہ امام زین العابدینؑ ہیں۔ آپ دعا کر رہے ہیں کہ اسلام کی سرحدوں کی جو حفاظت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمت بخشے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قدموں کو ثبات بخشے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کا نام بلند رکھے۔ لیکن امام کی معرفت حاصل کرنے کے لیے یہ بھی دیکھو کہ اس دعا مانگنے والوں کے ساتھ مسلمانوں نے کیا سلوک کیا۔ اس کا اندازہ اس سے کرلو کہ کربلا کے واقعہ کے بعد جب امام سے پوچھا گیا کہ کربلا میں کیا ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ مختصراً یہ سمجھ لو کہ اگر

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہماری مودت کے بجائے ہم سے عداوت کا حکم دیتا تو مسلمان اس سے زیادہ عداوت نہیں کر سکتے تھے تو ایک طرف مسلمانوں کا وہ سلوک اور ایک طرف امام کی یہ دعائیں۔ یہ امام کا مقام ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں امام امام ہے جس طرح نبی اپنی قوم کا نبی ہے۔ خواہ قوم اسے نبی مانے یا نہ مانے وہ نبی رہے گا۔ اسی طرح امام مانیں یا نہ مانیں وہ امام رہے گا۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے دنیاوی حیثیتوں کا تعین ہوتا ہے مگر جو باتیں یا جو مراتب منجانب اللہ ہیں ان کو ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے امام کو کچھ امام کی حیثیت سے مانتے تھے اور وہ لوگ جو ان کو امام نہیں مانتے تھے ان میں بھی کوئی ایسا بدبخت نہیں تھا جس کے دل میں ان کا احترام نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جنھوں نے ان کو قید خانوں میں رکھا۔ ان کے تقدس کے قائل تھے۔ تو گویا امام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے دعائے خیر مانگے۔ ہم اسی ملت اسلامیہ کے انقلاب کے spearhead بنے اسی وجہ سے ہماری یا ہمارے ائمہ کی مخالفت عوام المسلمین سے نہ تھی! امام اپنے ماموموں کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ ہاں ہماری مخالفت ظالم و جابر حکومتوں سے ضرور تھی اور وہ اس وجہ سے کہ انھوں نے تمام امت مسلمہ کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ ہم نے دین کو پھیلانے کے لیے سب سے زیادہ کام کیا۔ وہ جو حضرت علیؑ کا نام لیتے ہوں جو امام حسین کے نام لیوا ہوں۔ ان سے زیادہ اور کس کو اس بات کا حق ہے کہ وہ دنیا میں دین اسلام پھیلائیں۔ دوسرا اسلام کو کیا پھیلائے گا۔ وہ اسلام کی کیا تعریف کرے گا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ تبلیغ کسی نہ کسی ذریعہ سے ایک دوسرے تک پہنچتی رہی۔ ہم اس ذریعہ کو مانتے ہیں جس میں رسول اللہ کے بعد علیؑ تھے اور ان کے بعد دیگر ائمہ کا سلسلہ ہے۔ اسلام کی توجیہہ اور تعریف کرنا ہی تو تبلیغ

ہے۔ اگر ہم لوگ جوان ائمہ کو ماننے والے ہیں توجہ نہ کریں گے تو پھر یہ حق کس کو پہنچتا ہے۔ دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کا حق ان لوگوں کو ہے جن کے امام (حسینؑ) نے یزید کے خلاف جاتے وقت یہ کہا تھا کہ اس کے خلاف احتجاج کرنے کا سب سے زیادہ حق مجھے ہے اور یہ اس لیے کہا تھا کہ اسلام کے سب سے بڑے نمائندے وہ تھے۔ اسلام کے اصل ورثہ دار وہ تھے۔ اسلام کی علامت وہ تھے۔ لہذا عزیزو۔ تم ملت محمدی سے کٹ کر علیحدہ کبھی نہ ہو جانا۔ ہم نے کبھی کوئی فرقہ نہیں بنایا کیونکہ ہمارا منصب رہبری کرنا ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ ایک اقلیت یا Minority کے بقا کی صرف دو ہی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ جس ملت سے اس کا تعلق ہے اس کی رہبری کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ملت کے یعنی اکثریت کے پیچھے پیچھے چلتی رہے۔ دوسری صورت میں اس کی اپنی زندگی نہیں رہتی۔ اس لیے رہبری کرتے رہنا۔ اپنے دلوں کو کبھی تنگ نہ کرنا تم کو تکلیفیں پہنچیں گی۔ بہت باتیں ناگوار گزریں گی لیکن وہ سب اس سے زیادہ تو نہیں ہوں گی۔ جو ائمہ پر گزر رہی تھیں۔ کربلا کے واقعات تو ایسے ہیں جن کی کوئی مثال ہی نہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے امام حسنؑ اور امیر معاویہ کے صلحنامہ پر غور کرو۔ اس کی ایک شرط یہ تھی کہ مساجد میں برسرِ منبر جو حضرت علیؑ کی شان میں نازیبا کلمات استعمال ہوتے ہیں وہ بند کر دیئے جائیں گے۔ تمام تاریخیں گواہ ہیں کہ اس شق پر عمل نہیں ہوا حضرت امام حسنؑ مسجد نبوی میں پنج گانہ نماز پڑھتے تھے۔ اب ذرا غور کیجئے، اس شخص پر جو ہر نماز کے بعد اپنے معصوم باپ پر سب و شتم سنتا ہو۔ اس کے دل پر کیا گزرتی ہو گی۔ نہ مسجد نبوی میں حاضری ترک کر سکتے ہیں۔ نہ اپنے کان بند کر سکتے ہیں۔ حضرات! روزمرہ کی باتیں کبھی تاریخ کی کتابوں میں درج نہیں ہوتیں۔ امام حسنؑ کا روزمرہ

پانچ وقت مسجد نبوی آنا معمول تھا یاں اگر آپ مسجد نبوی میں جانا ترک کر دیتے
تو یہ غیر معمولی بات ہوتی کہ نبی کے نواسے نے مسجد نبوی میں نماز پڑھنا ترک کر دی
اور تاریخ کی کتابوں میں جلی حروف میں آتا۔ مگر آپ مسجد جاتے رہے۔ خدا
ہمارے آپ کے باپوں پر رحم کرے مروان کا تقابل امام حسنؑ کے والد سے
نہیں ہوسکتا پھر بھی ہم اپنے باپ کے متعلق کوئی نازیبا کلام سننا پسند نہیں کریں
گے۔ لیکن امام حسنؑ کی مجبوریاں دیکھیے کہ اپنے اس باپ کے متعلق سب کچھ سن
رہے ہیں جو امیر المومنین ہے۔ انھوں نے یہ سننا گوارا کیوں کیا؟ اس کی وجہ
یہ تھی کہ وہ امام تھے مسلمان ان کے ساتھ کیسا ہی سلوک کریں۔ لیکن ہمارے
اماموں نے وحدتِ ملی کے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں لہٰذا ہم بھی کبھی اپنے
مرکز سے نہیں ہٹنا اور اپنے اصل معاشرے سے کٹ کر علیحدہ نہ ہو جانا
یہ سبق ہم کو کعبہ سے ملا ہے۔ انسان اپنے مرکز کو نہ بھولے اپنے مرکز سے نہ کٹ
جائے۔ جس معاشرہ میں رہ رہا ہے اس معاشرہ کے خلاف دیواریں نہیں
کھڑا کرنا ہیں۔ ایک کونے میں بیٹھنا نہیں ہے آدمی اگر اپنے گرد دائرہ تنگ کرتا چلا
جاتا ہے تو یہ زندگی کی نشانی نہیں ہوتی یہ موت کی علامت ہوتی ہے۔ یہ ختم ہونے
کی علامت ہوتی ہے یہ بڑھنے کی علامت نہیں ہوتی۔ ہماری محفلیں ہوتی ہیں۔
ہماری مجلسیں ہوتی ہیں کیونکہ ہمارے پاس ایک پیغام ہے۔ آج یہ معاشرہ
جس میں ہم رہ رہے ہیں یہ یورپ کا ہے یہاں تو اگر [illegible] بھی آ جاتا
ہے تو لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ کتنے [illegible] ہیں جو یہاں سے
شروع ہو رہے ہیں میں پوچھتا ہوں کہ کیا دنیا کو دینے کے لیے تمہارے
پاس کوئی پیغام نہیں ہے؟ کیا تمہاری تمام کی تمام روایتیں رسم بن کر رہ گئی ہیں؟
یاد رکھو کہ جس گروہ یا جماعت کے پاس دنیا کو کوئی پیغام دینے کے لیے نہ ہو

تو اس کا وجود بے معنی ہے اور اللہ تعالیٰ اس جماعت کو ختم کر دیتا ہے۔ جب تک
آپ کے پاس انسانیت کے لئے کوئی پیغام ہے تو آپ زندہ ہیں ورنہ زندہ
رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ معاشرہ جس ضرورت کو شدت سے
محسوس کر رہا ہے تم اس ضرورت کو اپنے اس پیغام سے پورا کر سکو جو واقعۂ
کربلا سے حاصل ہوا ہے۔ حسینؑ کے نام لیوا صدیوں تک معاشرہ کی ضرورت کو اپنے علم
کے ذریعہ، اپنی سعی سے، اپنی محنت سے، اپنے وسیلہ اور معاشرہ کو قائم رکھ
کر اور کشادہ سینے کے ساتھ پورا کرتے رہے۔ اور دیکھو جس وقت حسینؑ
کا ذکر کرو تو اوروں کو بھی بلاؤ اور ان کو بتاؤ ہماری بھی ایک روایت ہے۔ ہمارا
رسولؐ عرب دیس میں پیدا ہوا تھا۔ اس معاشرہ میں پیدا ہوا تھا جو انتہائی وحشت
زدہ تھا۔ وہ لوگوں کو ظلمت سے نور کی طرف لایا۔ موت سے زندگی کی طرف
لایا۔ وہ ایسا انقلاب لایا جیسا انقلاب آج تک دنیا میں نہیں آیا۔ انھیں بتاؤ
کہ اسلام کیسے ابھرا اور کس معاشرہ میں ابھرا۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ مسلمانوں کا
دستور آئین constitution کیا ہے۔ پھر یہ بتاؤ کہ جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی
اور مسلمان حقیقتوں کو بھولتے چلے گئے۔ ان پر غفلت کے پردے پڑتے چلے گئے۔
اور حق کے علم بردار بننے کے بجائے انھوں نے بادشاہت اور سامراجیت کی
بنا ڈالی۔ اس وقت اسی رسولؐ کا ایک نواسہ تھا جس کے پاس کوئی سر و سامان نہ
تھا مگر اس نے سامراج اور بادشاہت کے خلاف آواز بلند کی۔ ہم کو طاقت کا ایک
نیا راز بتایا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ سچائی میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ ساز و سامان
کے زیادہ ہونے سے طاقت نہیں بڑھتی۔ اس نے مظلومیت کو ایک فعال
طاقت بنا کر دکھا دیا۔ اس نے حق کے راستے میں ایک نئی strategy بتائی
وہ جس وقت مکہ سے چلے تو بہت لوگ روک رہے تھے کہ کوفہ سے وہاں

طاقت ور لوگ ہیں۔ کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر اس اللہ کے بندے کے سامنے معلوم نہیں کیا تصویر تھی اور کیا strategy تھی وہ کہتا تھا کہ چونکہ مجھ کو لوگوں نے ہدایت کے لئے طلب کیا ہے اور میں امام ہوں لہذا میں اپنی حجت پوری کروں گا۔ اب وہ کس طرح حجت پوری کرتے ہیں یہ ان کا کام ہے۔ اور جب لوگ کہتے تھے کہ ان عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے جائیے تو جواب یہ ملتا تھا کہ نہیں۔ ان کے لئے یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ بھی جائیں گے اور لوگ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ کیوں لئے جا رہے ہیں لیکن جب وقت یہ واقعہ ہو گیا۔ تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ کیوں لے گئے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ اگر یہ نہ جاتے تو تمام کا تمام نقشہ ہی نامکمل رہتا۔ اس کو یوں سمجھو کہ ایک مصور کوئی تصویر بناتا ہے۔ ایک رنگ ادھر لگایا ایک برش ادھر لگایا۔ دیکھنے والے کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ یہ رنگ کیوں لگایا ہے۔ یہ نشان کیوں بنایا اب چونکہ پوری تصویر تو دیکھنے والوں کے ذہن میں ہے نہیں تو مصور یہی کہہ سکتا ہے کہ تم ذرا ٹھہرو۔ میں تم کو کیا بتاؤں کہ میری نظر میں کیا ہے۔ میں تم کو کیا بتاؤں کہ میری زینبؑ کیا کرے گی۔ میرا اصغرؑ کیا کرے گا۔ مگر جب واقعہ کربلا ہو چکے گا اس وقت اگر میں تم سے پوچھوں گا کہ اگر اصغرؑ کا رول نکال دیا جائے تو کیا رہے گا تو تم کہو گے کہ اس تصویر یعنی اس المیہ میں بڑی کمی ہو جائے گی۔ اگر یہ دس ماہ کا بچہ اپنے باپ کے ہاتھوں پر شہید نہ ہو اگر زینبؑ سر برہنہ کوفہ و شام کا سفر نہ کرے اور یزید کے دربار میں خطبہ نہ دے۔ اپنی تقریروں سے لوگوں کی آنکھوں سے غفلت کے پردے نہ ہٹاتے تو تصویر نامکمل رہ جاتی اور مقصد شہادت لوگوں پر واضح نہ ہو پاتا شہادت کے مقصد کی تبلیغ ہی نہ ہو پاتی۔

———

دوسری مجلس

تمام حمد اللہ کے لئے ہے جس نے انسان کو خلق کیا اور اپنی روح اس میں پھونکی انسان سے اپنا ایک تعلق پیدا کیا اور پھر اس سے ایک عہد لیا۔ اس نے ذریت آدم سے عالم ذر میں دریافت کیا "الست بربکم" اور ذریت آدم کی روحوں نے جواب دیا بے شک تو ہمارا رب ہے اور خود اللہ تعالیٰ اس عہد کو یاد دلاتا ہے کہ اے بنی آدم کیا ہمارا تمہارا عہد نہیں ہوا ہے کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور میری عبادت کرنا یہی صراطِ مستقیم ہے۔ ایک عہد اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ہوا اور اپنی طرف بلانے کے لئے اس نے ہادی بھیجے۔ اپنی رحمانیت سے اپنی رحمت سے اپنی کری ہے۔

اور ہمارا درود ہو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس ذات گرامی پر جس نے بندوں کو ان کے خدا سے بھولا ہوا تعلق یاد دلا دیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتہ کو پھر جوڑا۔ وہ کہ جس نے انسانیت کو ظلمت سے نور کی طرف اور موت سے زندگی کی طرف نکالا۔ وہ ذات کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ رحیم ہے اور رحمٰن ہے اور اس کے رسولؐ کی شان یہ ہے کہ وہ رحمت اللعالمین ہے۔ تمام عالمین کے لئے رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ رؤف اور رحیم ہے اور پیغمبر کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ یہ مومنوں پر بڑا رؤف و رحیم ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ الہادی ہے۔ تمام ہدایات اس کے لئے ہے اور رسولؐ کی شان

یہ ہے کہ اس کو دنیا میں ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاک کرنے والا ہے اور تمام عزت اسی کے لئے ہے اور پھر اللہ نے قرآن میں ارشاد فرمایا کہ تمام عزت اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہے۔ اس لحاظ سے رسولؐ کی تین شانیں ہیں۔ یعنی وہ اللہ کی رحمت ہے، بندوں کے لئے ہدایت ہے اور بندوں پر اللہ کی حجت ہے۔

ہمارا اسلام ہو آئمہ طاہرین پر جو اللہ کے ولی ہیں۔ نبیؐ کے وصی ہیں اور مومنوں کے مولا اور امیر ہیں۔ یہ امامت کی تین شانیں ہیں۔

دین میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک عبادات، دوسرے اخلاقیات، تیسرے معاملات معاملات کے معنی ہیں worldly affairs یعنی دنیا میں کس طرح رہا جائے اور کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اگر زندگی کے علیحدہ علیحدہ مختلف خانے ہو جائیں یعنی ایک خانے میں عبادت ہو جائے اور ایک خانے میں دنیاوی معاملات تو پھر معاملات عبادت کی روح سے عاری ہو جائیں گے۔ اور عبادت ایک خاص رسم بن جاتی ہے۔ عبادت اور معاملات کے الگ ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دنیاوی معاملات میں دین کی ہدایت نہیں رہتی۔ عبادت اور دنیاوی معاملات کا تعلق یہ ہے کہ عبادت زندگی کا مرکز ہوتی ہے اور تمام زندگی اس کے چاروں طرف پھرتی ہے۔ جیسے انسانیت کعبہ کے گرد دونوں dimensions میں یعنی کس وقت سے اور کہاں کہاں سے لوگ اس کے گرد طواف کرتے ہیں۔ انسانیت اپنے اصل مرکز کا طواف کرتی ہے یعنی وہ کعبہ جو خدا سے منسوب ہے اس کا طواف کرتی ہے۔ یہی تعلق انسان کی زندگی میں عبادات اور معاملات کا ہے۔ اسی وجہ سے صلاۃ یعنی نماز کو زندگی کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہمارے رسولؐ یا امام جب دنیا سے رخصت ہوتے تھے تو لوگوں کو الصلاۃ (نماز) کی وصیت کرتے تھے کیونکہ زندگی میں اس کا مقام مرکزی ہے۔

تمہارے تمام معاملات، تمہاری دوستی، تمہاری دشمنی، تمہاری تجارتیں سب بیکار ہیں اگر ان میں عبادت کی روح سرایت نہیں کرتی۔ یہ جو پانچ وقت نماز پڑھی جارہی ہے عبادت ہو رہی ہے اس کی روح تمام اعمال میں سرایت کرنی چاہیئے۔ ہورا سی وقت زندگی اکائی بنے گی۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو عبادت ایک طرف ہو گئی اور معاملات دوسری جانب۔ پھر ہم میں اور ان لوگوں میں کیا فرق رہ گیا جو اللہ کو نہیں مانتے عقیدہ کا انسان کی زندگی پر بڑا اور نمایاں اثر ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عقیدہ سے انسان کی صورت بدل جاتی ہے۔ عقیدہ صورتوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور وہ اچھائیاں یا برائیاں جن پر وہ یقین رکھتا ہے اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے سب چہروں سے جھلکنے لگتی ہیں۔

تو عزیزو فرق ضرور ہونا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ جیسی زندگی اللہ کو نہ ماننے والوں کی ہے ویسی ہی زندگی اللہ کو ماننے والوں کی ہے۔ صرف پانچ وقت نماز پڑھ لینا ہی کافی نہیں کیونکہ نماز اس وقت تک صرف ایک رسم ہے جب تک اس کی وجہ سے زندگی کی اقدار۔ مقاصد اور طریقوں میں کوئی فرق پیدا نہ ہو۔ جب تک نماز کی روح زندگی کے تمام اعمال میں سرایت نہ کر جائے اور جو زندگی کے تمام شعبوں پر اثر انداز نہ ہو۔ نہ نماز ہے نہ اللہ کی عبادت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک رسم ہوتی ہے جو چلتی رہتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک خاص معاشرے کی پیداوار ہوتی ہے۔ اور پھر جب معاشرہ بدل جاتے اور اس کی عبادت میں جان نہ رہے تو ایک نسل اور دوسری نسل میں ایسی زبردست خلیج واقع ہو جاتی ہے کہ نہ یہ ان کی بات سمجھتی ہے اور نہ وہ ان کی۔ رفتہ رفتہ اس رسم میں جان نہیں رہتی اور معاشرہ اور ماحول کے ساتھ وہ بھی بدلتی چلی جاتی ہے۔ اور اس کی زندگی ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ میں نے ان باتوں کا تذکرہ اس لئے کیا کہ ہماری گفتگو میں کوئی Relevance زندگی کے لئے ہدایت۔ اس زندگی کے مسائل کے لئے کوئی حوالہ

یا ان کو سوچنے کے لیے ہمارے دین کا، ہماری روایت کا ہماری تاریخ کا ہونا لازمی ہے ورنہ یا کوئی بات نہ ہوتی گویا پوجا پاٹ کرنا ہے تو کسی پروہت کو بلا لیا اور اس نے پوجا پاٹ کرا دی اور تھوڑی سی دکشنا اس کو مل گئی۔ یہ مسلمانوں کی عبادت نہیں یہ مسلمانوں کا ذکر نہیں۔ اسی وجہ سے ہم اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ جب امام حسینؑ کا ذکر کریں تو تعقل سے کام لیں۔ آگے پیچھے دیکھیں، سوچیں۔ ان چیزوں سے جو آگے ہیں اور جو پیچھے ہیں ان سے ڈرنے کا نام تقویٰ رکھا گیا ہے کلام پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ کتاب اس حقیقت کی تصدیق کرنے والی ہے ان چیزوں کی جو تمہارے ہاتھوں کے بیچ میں ہیں جو تمہارے سامنے پڑی ہوتی ہیں۔ لہذا ہمارے دین میں تفکر اور تعقل کرنا۔ آگے اور پیچھے دیکھنا اپنے پیش پا افتادہ حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کرنا بھی ایک عبادت ہے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑنے کی بات ہے جس وقت ہم ذکر حسینؑ کرتے ہیں اس وقت ہمارے سامنے اسلام کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ اسلام کی بنیادیں بھی سامنے ہوتی ہیں۔ اللہ پر بھی ہماری نگاہ جاتی ہے کیونکہ یہ تو سب سے بڑی نشانی اللہ تعالیٰ کی ہے اس کی سب سے بڑی روشن آیت ہے اگر حسینؑ کا ذکر کے تمہاری نظر اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں گئی تو تم نے کس کا ذکر کیا۔ اس لئے کہ حسینؑ تو اللہ کی روشن آیت ہے۔ جیسے راستہ دکھانے کے لیے قبلہ نما ہوتا ہے۔ سمت مقرر کرنے کے لئے پہلے تم قطب شمالی ہی کو معلوم کرتے ہو۔ اگر کربلا کے واقعے سے اللہ اور بندے کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا تو پھر اس واقعہ میں کوئی عبرت تو نہیں رہی صرف ایک مصیبت ہی مصیبت رہ گئی۔ اس مصیبت کا پلہ بھی بہت بھاری ہے مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس واقعہ سے جو نصیحت حاصل کرنی ہے جو عبرت حاصل کرنی ہے جو اس سے معرفت حاصل کرنی ہے اور دین کی اصل و بنیاد جو ہے وہ ہے ایک بندے کا اپنے اللہ سے تعلق۔

تمام معاشرہ اس حلقے کے اندر آجاتا ہے۔ معاملت بھی اس میں آجاتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف یہ سفر اسی وادی سے ہو کر گزرتا ہے۔ اسی زندگی کے اندر سے انہی محبتوں، تجارتوں، نفع نقصان کے بیم و رجا اور زندہ رہنے کے طریقے کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہونچتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اے انسان تو بڑی مشقتوں اور تکلیفوں کے ساتھ اپنے رب کی طرف چلتا ہے۔

تو عزیز و اس کی صورت یہ رہی کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس نے انسان میں اپنی روح پھونکی۔ عالم ذر میں انسان سے عہد لیا کہ آ است بربکم اور ہم نے کہا "بلا" اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع ہو جو قادر ہے جو تمام ادراک اور احساس سے بلند ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ دین کی ابتدا ایک عہد ایک commitment سے ہوتی ایک بیعت سے ہوتی بندے کا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ بیعت کس کو کہتے ہیں۔ یہاں اس commitment کا ذکر ہے جس سے دین کی ابتداء ہوتی۔ بیعت کے معنی ہیں بیچنا یا خریدنا۔ دونوں معنی ہوتے ہیں عربی میں اس کو اضداد کہتے ہیں۔ مگر یہ ضدیں نہیں ہوتیں بلکہ ایک دوسرے کی complementary ہوتیں۔ بیعت ایک مکمل سودا ہے۔ وہ سودا جس کا ایک حصہ فروخت کرنا ہے اور دوسرا حصہ خریدنا ہے۔ اور اس کے تکملے کے نشان کے طور پر ایک ہاتھ کا دوسرے کے ہاتھ پر مارنے کو بیعت کہتے ہیں تو ابتدا اس بیعت سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہادی بھیجے تاکہ وہ انسان کو یہ بیعت یاد دلاتے۔ اس بھولے عہد کو یاد دلائے۔ اگر اللہ نے اپنی روح ہمارے اندر نہ پھونکی ہوتی تو ہم اس کی معرفت تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مگر چونکہ اس نے خود فرمایا ہے کہ اس نے اپنی روح پھونکی۔ اس وجہ سے بندے کو اس کی معرفت ہو سکتی ہے۔ انبیاء آئے

لئے آئے کہ اس وعدے کو یاد دلائیں اور غفلت کے پردے جو پڑ گئے ہیں ان کو ہٹائیں
اور انسان کو اس کی فطرت اصلی اور اولی سے روشناس کرائیں۔ ہمارا دین دو شہادتوں
پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ کوئی خدا نہیں بجز اللہ کے یعنی اگر کوئی چیز اصل حق اور حقیقت
ہے۔ وہ اللہ کی ذات ہے باقی تمام حقیقتیں مستعار ہیں اور اسی حقیقت کے پرتو ہیں۔
اسی حقیقت کی ایک عطا ہے اسی حقیقت کی بخشش ہیں ورنہ سب کے سب مجازی ہیں
آج ہیں کل نہیں یہ سب بہت تھوڑے عرصے کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان کے لئے
بقا بھی ایسی ہے جیسے فنا۔ یہ ممکنات میں سے ہیں۔ واجبات سے نہیں ہیں۔
حق ذات خالص و محض ہے یعنی Absolute Reality اور یہی حقیقت Reality
مختلف مراتب میں چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اور اس کے باہر کوئی حقیقت
نہیں ہے۔ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے لوگو لا الہ الا اللہ کہو اور
فلاح پاؤ۔ یہ کلمہ دین سے وہ نسبت رکھتا ہے جو بیج کو اپنے شجرے ہوتی ہے۔
دوسری شہادت یہ ہے کہ "محمد اللہ کا بندہ ہے اور اس کا رسول ہے"۔ عبد
ہے کہ محمد کا تعلق ہم سے پیدا ہوا اور رسول کہ ان کا تعلق اللہ سے پیدا کیا گیا۔
بندوں اور اللہ کے مابین اگر کوئی واسطہ ہے تو وہ رسول ہے۔ اگر بندے یہ معلوم
کرنا چاہیں کہ اللہ کیا چاہتا ہے اس کی بیعت کیسے ہو تو یہ ہاتھ ہیں رسول کے ہاتھ۔
اور ان ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ رسول کے ہاتھ پر بیعت اللہ کے ہاتھ پر بیعت
ہے۔ اور اسی وجہ سے قرآن پاک میں جگہ جگہ پر اللہ اور رسول کا ایک ساتھ ذکر ہے۔ "تمام
عزت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے"۔ اور "اے رسول جس نے تیرے ہاتھ
پر بیعت کی اس نے اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ تو اس طرح ہمارے لئے یہ ہے
کہ ہم جس خدا کو مانتے ہیں جس کے سامنے سر جھکاتے ہیں وہ ہمارے رسول کا
خدا ہے۔ وہ خدائے محمدؐ ہے۔ ہمارا دین ایک حقیقت کو تسلیم کرنا اور ایک حکم

کی اطاعت کرنا۔ یعنی اس حکم کی جو اس رسول کے ذریعے آیا اور جسے ہم اللہ کا حکم سمجھتے ہیں۔ اسی میں ہمارا سارا دین آجاتا ہے۔

کلام پاک میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں ان کا عمل رائیگاں نہیں جائے گا۔ یعنی بنیادی اصول اللہ اور آخرت پر ایمان ہے۔ بندہ یہ سمجھے کہ میں اللہ کی عبادت کرنے والا ہوں اور اس کے سامنے جوابدہ ہوں۔ جب بندے نے اپنی ذمہ داری اللہ کی طرف سمجھ لی تو اس نے دین کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ یہ دین کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اللہ پر ایمان اور یوم آخرت پر یقین۔ اور قرآن پاک میں ایک سے زیادہ مقامات پر اس کا ذکر ہے اور اس میں اسلام وغیرہ کی کوئی بات نہیں ہے صرف یہ ہے کہ جس نے اللہ پر ایمان رکھا اور یوم آخرت پر ایمان رکھا تو اس کا عمل رائیگاں نہیں جائے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے جو کچھ کر رہا ہے تو وہ اس کا اجر دے گا۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ایک ملت کو بنانے کے لئے ایک جماعت کو بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو دنیا تک پہنچانے کے لئے اور ایک ایسی ملت کی اساس ڈالنے کے لئے کہ اس کے پیغام کو لے کر آگے بڑھو اس نے اپنے رسولؐ بھیجے صرف ہادی بنا کر نہیں اپنا نمائندہ بنا کر تاکہ تم جو کچھ اللہ کے متعلق۔ اس کے احکام کے متعلق اس کی رضا اور ناراضگی کے متعلق معلوم کرنا چاہتے ہو تو اس کا نمائندہ موجود ہے۔ اس کے ذریعے معلوم کر لو۔ لہٰذا تیسرا اصول یہ طے پایا کہ محمد مصطفیٰؐ کو اس کا رسول برحق مانا جائے۔ اللہ نے بندوں کو بنایا ان میں اپنی روح پھونکی ان سے عہد لیا۔ خدا اور بندے کا تعلق قائم ہوا۔ ایک commitment ایک تعلق بندے کا اللہ سے پیدا ہو گیا اور اس نے یہ بات تسلیم کر لی کہ ہم تیرے سامنے جوابدہ ہیں۔ اس ذمہ داری کا احساس ہوتے ہی دین کی ابتدا ہو گئی۔

پھر جس وقت رسول پر ایمان لائے تو ایک ملت میں داخل ہو گئے۔ ایک حصار اور سلامتی کے دائرے میں آ گئے۔ یعنی جو شخص اللہ کی وحدانیت یوم آخرت اور محمد مصطفیٰؐ کی رسالت پر ایمان لائے اور جو یہ مانے کہ جتنے پیغام اور احکام اللہ کی جانب سے آئے ہیں اور جو ہدایت آئی ہیں وہ محمد رسول اللہؐ کے ذریعے آئی ہیں وہ ملت اسلامیہ کے حصار میں داخل ہو گیا۔ یہ رسول اللہؐ کی رحمت ہے۔ بندوں کے لئے ہدایت اور اس کی حجت ہے۔ اس حجت کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بندے کو یہ عذر نہ رہے کہ ہمارے پاس تو ہدایت آئی ہی نہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہی نہ تھے کہ اس کی رضا کیا ہے۔ کس بات سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور کس بات سے ناراض ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کا سامان اپنے رسولؐ کے ذریعے سے پیدا کر کے بندوں پر اپنی حجت تمام کر دی۔ اس لئے کہ عدل کا یہ تقاضا تھا کہ سوال و جواب سے پہلے برائی اور بھلائی کرنے سے پہلے بندوں کو پوری طرح سے ہدایت کا سامان فراہم کر دیا جائے۔ یہ عدل کا ایک پہلو ہے۔ اس میں دیکھو کہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے وہی اس کا عدل ہے۔ اللہ نے اپنے نبی کو بھیجا۔ اپنی رحمت بنا کر بھیجا۔ اپنی حجت پوری کرنے کے لئے بھیجا اور جس وقت ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ آخرت کا کیا تعلق ہے۔ خدا اور بندے کا کیا تعلق ہے۔ آخرت میں سزا اور جزا کا کیا معیار ہے اور ہم نے عدل کو دین کا ایک اصول بنایا تو پھر اللہ اور بندہ کا تعلق اور ابتدائے آفرینش سے آخرت تک کا معاملہ سمجھ میں آ گیا کہ تمام کی بنیاد عدل پر ہے۔

جس نے عدل کو اپنے دین کا اصول نہیں سمجھا۔ اس نے توحید کو تو مانا مگر اللہ اور بندے کے تعلق کو نہ سمجھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عدل کی بات نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اگر وہ عدل پر اتر آئے تو ہم میں سے

کون ایسا ہے جو بخشا جائے گا۔ اور کیا اللہ نے بار بار اپنے کو رحمٰن اور رحیم نہیں کہا
ہے۔ بیشک اللہ نے اپنے آپ کو رحمٰن و رحیم کہا ہے۔ رحمٰن اور رحیم دو الفاظ استعمال
کئے ہیں جو ایک ہی مادہ سے نکلتے ہیں۔ رحمٰن کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود رحمت کرتا ہے
اس میں کسی کے استحقاق کا سوال نہیں ہے۔ وہ رحمت اس لئے کرتا ہے کہ یہ اس
کی عادت ہے وہ رحمت کرتا ہے۔ مومنوں پر وہ رحمت کرتا ہے کافروں پر وہ۔ ہر
ایک پر رحمت کرتا ہے جس طرح اس کی بارش سب پہ عام ہوتی ہے اسی
طرح اس کی رحمت سب پر عام ہے۔ رحمانیت کی صفت سب کے ساتھ جاتی ہے
اور چونکہ ہر ایک اس کا بندہ ہے لہذا اس کی رحمت سب کے لئے ہے۔ رحیمی کا
مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے بندوں کی ہدایت کا سامان پورا کیا۔
جو بندہ اس کی طرف ایک قدم بڑھتا ہے اللہ تعالیٰ دس قدم اس کی طرف بڑھتا
ہے۔ اس کی رحمت کی شان خاص طور سے ایمان لانے والوں کے لئے ہے اور پھر
اس کا تعلق "مالک یوم الدین" سے جاملتا ہے۔ اس کی رحمت کا ایک aspect ربوبیت
کی طرف ہے۔ پہلے رب کا ذکر ہوا پھر رحمان کا ذکر ہوا پھر رحیم کا ذکر ہوا پھر مالک
یوم الدین کا ذکر ہوا یعنی دوسرا aspect عدل ہے۔ رحیمی کی طرف جو رحمت کا
aspect ہے اس کا تعلق عدل سے ہے مالک یوم الدین سے ہے۔ تو یہ سیاسی
تقاضے تھے کہ برے کو برا نہ کہا جائے اور اچھے کو اچھا نہ کہا جائے کہ لوگوں نے
یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تو بڑا رحمٰن و رحیم ہے۔ کیوں کسی کے لئے یہ کہتے ہو کہ اس
نے اتنی بری باتیں کیں یا اتنی اچھی باتیں کیں۔ نہیں کیا معلوم۔ اللہ تو بڑا بخشنے والا
ہے وہ چاہے تو سب کو بخش دے۔ گویا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر جو پروپیگنڈہ
شروع ہوا وہ عقیدوں پہ اثر انداز ہو گیا۔ اور اسی وجہ سے عدل کا لفظ کھٹکنے لگا۔
بس صرف رحمانیت کو یاد کرتے چلے جاؤ اور یہ نہ سمجھو کہ وہ مالک یوم الدین بھی ہے

جہاں وہ رحمٰن ہے وہاں وہ منتقم بھی ہے۔

ہدایت کا کام ایک وقت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو مستقل طور پر چلا آرہا ہے۔ اس سلسلۂ ہدایت کو اہل معرفت حقیقت محمدی کہتے ہیں۔ اور یہ حقیقتِ محمدی پہلے بشر یعنی آدم سے لے کر امامت کی منزلوں سے گزرتی ہوئی قیامت تک جاری ہے۔ ہدایت کا سلسلہ جاری ہے اور اللہ کی حجت سے زمانہ خالی نہیں ہے۔ اسی لئے ہمارے رسول ؐ نے ہم کو بتا دیا کہ ہمارا اول بھی محمدؐ ہمارا اوسط بھی محمدؐ اور ہمارا آخر بھی محمدؐ ہے۔ یہ حقیقت محمدی ابدی حقیقت ہے یہ اللہ تعالیٰ کے ہادی ہونے کی شان ہے۔ یہ اس کی رحمت ہے یہ اس کے ہادی ہونے کی صفت ہے اور یہ صفت کسی نہ کسی صورت میں ہر زمانہ میں کارفرما رہتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت کسی بھی وقت معطل نہیں رہ سکتی۔ تو جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ کارِ ہدایت وہ حقیقتِ محمدی قائم ہے تو ہم نبوت کے اصل پھیلاؤ کو سمجھ گئے۔ اور اس کی روحِ ہدایت کی ابدی حقیقت کو سمجھ گئے۔ ہم نے اس ابدی حقیقت کو کسی ایک فردِ واحد پر حصر نہیں کر دیا بلکہ وہ شخص جو اس حقیقت کا ترجمان تھا۔ ہم نے اس کو دیکھا اور اس کی زبان سے یہ سنا کہ اولنا محمد وسطنا محمد وآخرنا محمد تو اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ حقیقتِ ابدی کسی ایک شخص کے لئے مختص نہیں ہو سکتی جو ایک خاص وقت کے لئے دنیا میں آیا اور ایک خاص وقت پر دنیا سے رخصت ہو گیا بلکہ یہ اپنی اس ابدی حقیقت کا نمائندہ ہے جو ازل سے ہے اور قیامت تک جاری رہنے والی ہے لہٰذا جب عدل کو سمجھے تو اللہ سے بندے کے تعلق کو سمجھے اور جب امامت کو سمجھے تو نبوت کی حقیقت اور گہرائی کو پا گئے اگر ہم نے عدل کو اصول دین میں داخل نہ کیا تو اللہ اور بندے کے تعلق سے بے بہرہ رہے اور اگر ہم نے امامت کو اصول دین میں شامل نہ کیا تو نبوت

کی حقیقت سے نا آشنا رہے اور خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اگر ہم اللہ کو مان گئے۔ یوم آخرت پہ یقین کر لیا۔ اور یہ تسلیم کر لیا کہ اللہ اور ہمارے درمیان وسیلہ رسولؐ ہے تو ہم اسلام کے دائرے یعنی امتِ محمدیؐ میں داخل ہو گئے اور جب یہ بھی مان لیا کہ اللہ اور بندے کا تعلق عدل کا ہے اور حقیقت محمدی ہمیشہ قائم رہنے والی ہے تو ہم حلقۂ ایمان میں داخل ہو گئے۔

امام کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں (i) وہ اللہ کا ولی ہوتا ہے۔ ولی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو با عصمت پیدا کیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ایک کتاب کو بلا نقص پیدا کر سکتا ہے تو پھر انسان کو بھی یقیناً معصوم پیدا کر سکتا ہے۔ ولی ہونے کی وجہ سے نورِ بصیرت رکھنے والا ہوتا ہے۔ کلام پاک میں لفظ نور استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ کہ جو اللہ کے نور ہی سے دیکھتا ہے۔ نورِ معرفت سے دیکھتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم اس بندے پر ہوتا ہے اور وہ بندہ کیا کرتا ہے اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ تمام چیزوں سے علیحدہ ہو کر اس کا ہر عمل اس کا جینا اس کا مرنا، اس کا سونا جاگنا۔ عبادت غرض یہ کہ ہر بات اللہ کی خوشنودی کے لئے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قدم پہ اس کی ہدایت فرماتا ہے۔ (ii) امام رسول کا وصی اور وارث ہوتا ہے جو کار رسالت اور ہدایت رسول کا کرتا ہے وہ امام کے ذریعہ جاری رہتا ہے (iii) رسولؐ کی طرح امام بندوں پر حجت ہوتا ہے۔ یعنی بندے یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمارے لئے کوئی ہدایت کرنے والا اور رہبری کرنے والا نہ تھا۔ رسولؐ اور امام میں ایک فرق ہوتا ہے۔ رسولؐ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور اسی سے اس کو نسبت ہوتی ہے۔ رسولؐ امت کا رسول نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کا رسول ہوتا ہے اللہ کا پیغام لے کر آتا ہے۔ اور امام امت کا امام ہوتا ہے اللہ کا امام نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ رسول داعی ہوتا ہے اللہ کی طرف بلانے والا ہوتا ہے اور امام راعی ہوتا ہے گلہ بان ہوتا ہے۔

گلہ کا نگہباں ہوتا ہے۔ امام امت کا نگہباں ہوتا ہے کہ امت ٹھیک راستے پر چلے۔ اس کا کام ہے کہ دیکھے کہ امت کی روحانی صحت کیسی ہے کہیں اس کی غذا زہر آلود تو نہیں کون سے بھیڑیئے اس کے زمانے میں گلے کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بھیڑیوں سے امت کو بچانا ہے۔ رسول داعی ہے۔ دنیا کو دعوت الی الحق دیتا ہے۔ اب جو اس کی بات سنتے اور مانتے ہیں وہ ایک ملت بن جاتے ہیں اور اس ملت کو آگے چلانا اور راہ راست پر رکھنا امام کا کام ہے۔ امام کو یہ دیکھنا ہے کہ امت توحید اور عدل کے اصولوں پر قائم ہے۔ امام کا ہر کام ہدایت کے لیے ہوتا ہے اگر وہ خاموش رہتا ہے اور گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے۔ اس میں بھی ہدایت کا پہلو ہے۔ اگر وہ کسی دشمنِ دین کے ساتھ مصالحت کرتا ہے اس میں بھی ہدایت ہے اگر وہ کسی سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا ہے تب بھی ہدایت ہے رسول خدا نے فرمایا کہ میرے دونوں فرزند امام ہیں خواہ وہ کھڑے ہوں۔ یا بیٹھیں، قیام یا قعود کی حالت میں ہوں۔ بیٹھنے سے اشارہ امام حسنؑ کی طرف ہے اور کھڑے ہونے سے اشارہ امام حسینؑ کی طرف ہے، یعنی اگر کسی کی مخالفت کرتا ہے تو وہ بھی ہدایت ہے۔ اگر وہ لوگوں سے پردہ کرے تب بھی ہدایت ہے۔ الغرض اس کی ہر حرکت اور ہر بات امت کے لئے ہدایت ہے۔

امام حسینؑ کے لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ آپ نے حضرت مسلم کو کوفہ بھیجا۔ ان کا خط کوفہ سے آگیا۔ امام حسینؑ یہ سمجھے کہ کوفے میں ان کے مددگار بہت ہیں اور وہ چل دیئے وہاں کوفے والوں نے غداری کی۔ یعنی کربلا کا واقعہ مختصراً یوں بیان کیا جاتا ہے۔ آپ ذرا غور کریں اور تاریخ کے اوراق پر نظر دوڑائیں۔ اور تاریخوں Dates کا لحاظ کریں تو اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔ واقعات کو تاریخ وار chronological order میں دیکھئے۔ رجب ۶۰ھ میں امیر معاویہ

کا انتقال ہوا۔ رجب کے آخر میں نعمان حاکم مدینہ امام حسینؑ سے یزید کے لئے
بیعت طلب کرتا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر بھی مکہ چھوڑ کر مکہ جاتے ہیں۔ اور امام حسینؑ
۳؍شعبان کو مدینہ چھوڑتے ہیں اور آخری شعبان میں مکہ پہونچتے ہیں اور شعب ابوطالب
میں قیام کرتے ہیں جو بستی سے دور جگہ ہے۔ یعنی کسی ایسی جگہ نہیں ٹھہرے جہاں بہت
لوگ ہوں اور ان کو بتایا جارہا ہو کہ ہمارا یہ cause ہے یہ مقصد ہے اور اس
طرح مسلمانوں کو اپنی طرف بلانے کے لیئے تبلیغ ہو رہی ہو۔ آپ نے شعب
ابوطالب میں قیام کرنا پسند فرمایا کیونکہ یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں اللہ کی پناہ میں دنیا
والوں کے مقابلے میں اللہ کا رسولؐ آیا تھا اور اب اسی رسولؐ کا وارث حسینؑ
یہیں پناہ لینے آیا۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ امام حسینؑ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔
کہ لوگ زیادہ ان کے پاس آئیں یا آپ وہاں سے نکل کر لوگوں کے پاس جائیں
اور ساز باز کریں جس طرح طاقت اور اقتدار کی ہوس رکھنے والے کرتے ہیں۔ آپ
شعب ابی طالب میں ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ تمام اطراف سے حاجی آرہے ہیں
کیا ان کی کیفیت ہے۔ کیا سوچ رہے ہیں۔ ہاں ملنے کے لئے عبداللہ ابن زبیر
آتے ہیں عبداللہ ابن عمر اور عبداللہ ابن عباس آتے رہیں۔ لیکن آپ کسی کے پاس
نہیں جاتے۔ ۱۰؍رمضان کو کوفہ سے پہلا خط آتا ہے۔ وہ سلیمان سراؔی کا خط ہے
جس میں مسلم ابن عوسجہ اور حبیب ابن مظاہر کے بھی دستخط ہیں۔ کوفہ کی کیفیت یہ ہے
کہ وہ سپاہیوں کی چھاؤنی ہے اور اسی مقصد سے وہ آباد کیا گیا تھا۔ چونکہ حضرت علیؑ نے
اسے اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔ لہذا رسول اللہ کے بعض مشہور صحابی یعنی حجر بن عدی
اور مسلم ابن عوسجہ جیسے چند بزرگ بھی وہاں آباد ہو گئے تھے ورنہ شہر کی اکثریت
وظیفہ دار سپاہیوں کی ہے۔ وہ لوگ جو امیرالمومنین حضرت علیؑ کا دامن تھامے
ہوئے تھے انھوں نے یا تو کربلا جا کر اپنی محبت کا حق ادا کر دیا یا جو وہاں نہ آسکے

انھوں نے بعد میں ادا کیا۔ ہمارا اسلام ہو ان پر جنھوں نے حق محبت ادا کیا۔ ان حضرات کا خط ۱۰ رمضان کو پہونچا۔ امام حسینؑ توقف فرماتے ہیں اور خط آنا شروع ہوتے ہیں اور ان خطوط لکھنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو وقت کے پرستار تھے کیونکہ جب انھوں نے دیکھا کہ کوفہ کے معتبرین ۲،۳،۴،۵،۶،۷ امام حسینؑ کی طرف گئے ہیں تو حکومت ادھر جاتے گی تو جس طرح تنخواہ دار سپاہی ہوتے ہیں ہم بھی ہیں ہمارا نام بھی ذرا نمایاں ہو جائے تاکہ جس وقت انعام بٹنا شروع ہو اور نئی حکومت کے عہدہ دار مقرر کیے جائیں تو ہمارا نام بھی نمایاں ہو اور حصہ اچھا ملے۔ آخری خط کوفہ سے ۱۰ ذیقعد کو آتا ہے جس میں لکھا ہے کہ آپ زمانے کے امام ہیں اگر آپ نے ہماری بات نہ سنی تو روز قیامت ہم اللہ تعالیٰ سے فریاد کریں گے کہ ہم امام کو ہدایت کے لیے بلا رہے تھے مگر انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اب یہ امت اپنے امام سے حجت پوری کر رہی ہے ہم سب منتظر ہیں آپ کی ہدایت کے لیے ہدایت کرنا آپ کا کام ہے۔ آپ کا حق ہے آپ کا فرض ہے اور اگر اس فرض سے آپ نے کوتاہی کی تو ہم اللہ تعالیٰ سے شکایت کریں گے کہ جس کو تو نے ہادی بنایا تھا ہم نے اس کی طرف دیکھا تھا مگر اس نے ہماری ہدایت نہ کی۔ لہٰذا اب امام حسینؑ نے ۱۲ ذیقعد کو حضرت مسلم کو کوفہ کے لیے روانہ کیا۔ یہ تمام داستانیں ذہن میں رکھیے کہ حضرت مسلم نے کوفہ سے ہمت افزا خط لکھا جس پر امام کوفہ کے لیے روانہ ہوتے۔ کیونکہ ان کی کوئی حقیقت ہو ہی نہیں سکتی۔ جس دن مسلمؑ شہید ہوتے ہیں اسی دن امام مکہ سے روانہ ہوتے ہیں، جناب مسلمؑ ۱۲ ذیقعد کو روانہ ہوتے ہیں اور ذی الحجہ کی پہلی تاریخ کو کوفہ پہنچتے ہیں اور ۹ ذی الحجہ کو شہید کر دیتے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں حضرت مسلم کیسے امید افزا خط لکھ سکتے تھے۔ ہاں ان کے دو خط امام کو راستے میں ضرور ملے جن کے متن دستیاب نہیں لیکن ان کے مضمون کو امام کے اس

رد عمل سے سمجھا جا سکتا ہے جو آپ پر ہوا۔ آپ نے فرمایا بے شک انسان موت سے ہمکنار ہے۔ اور مجھے تو اپنے بزرگوں سے ملنے کا اتنا شوق ہے کہ جتنا یعقوب کو یوسف سے ملنے کا شوق تھا۔ اور مجھے معلوم ہے کہ فلاں اور فلاں مقام کے درمیان میری لاش پڑی ہوئی ہے اور وحشی جانور میرے گوشت سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ اور پھر آپ نے فرمایا کہ جو لوگ ساتھ جا رہے ہیں ان پر واضح کر دو کہ ہم اہلبیت تو اس بات سے رضامند ہیں جو اللہ کی رضا ہو میں اس سفر کو جاری رکھوں گا جس کا دل چاہے میرے ساتھ چلے ورنہ واپس چلا جائے۔

تیسری مجلس

پاک ہے وہ ذات جس نے آدم کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا اور اس کو تمام اسماء تعلیم کئے اور اسماء تعلیم کرنے کے بعد فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ایک جن کے۔ کلام پاک میں ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا۔ وہ جن تھا۔ سو ابلیس نے تکبر کیا اور سجدہ نہیں کیا۔ پاک ہے وہ اللہ جس نے کچھ کلمات سے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ اور جب جناب ابراہیم امتحان میں پورے اترے تو اس نے ان کو لوگوں کا امام بنایا۔ اور جس وقت ابراہیم نے اپنی ذریت کے لئے درخواست کی تو جواب ملا کہ ہاں امامت ذریت میں رہے گی لیکن اس سے وہ لوگ خارج ہوں گے جو ظالم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آلِ ابراہیمؑ میں امامت کو قائم کیا اور وہ امام اللہ کے حکم سے ہدایت کرنے والے ہوئے اللہ نے ان پر الہام کیا اور وحی کی خیر کے واسطے نماز کے واسطے اور زکوٰۃ کے واسطے اور اس طرح امامت کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم دیا۔ ان کو عصمت دی ان کو امن دیا۔

میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰؐ پر جن کی بعثت کا مقصد کلام پاک میں اللہ نے یہ بتایا کہ یہ رسول آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے۔ لوگوں کے نفس کا تزکیہ کرتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے یہ لوگوں کو کتاب و حکمت کا علم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو یہ لوگ نہیں جانتے۔

میں سلام بھیجتا ہوں آئمہ کی ذات پر وہ کہ حامل قرآن تھے جو وارثِ

قرآن تھے۔ جو ظلم کی مخالفت کرتے تھے اور قسط عدل کو قائم کرتے تھے وہ
کہ جن کی زینت سچائی تھی اور جن کے نفس رضائے الہٰی کے پابند تھے۔

اس سے قبل کی تقریروں میں دین کے اصول عرض کر چکا ہوں۔ اللہ پر اور
یوم آخرت پر ایمان لانے سے ابتدا ہوتی ہے۔ بندہ اور خدا کا تعلق قائم ہوتا ہے
بندہ جو کچھ کرتا ہے اس کا جوابدہ ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے
یہ دین کی مشترک اساس ہے جو کہ تمام مذاہب میں ہے۔ اسی لئے قرآن پاک
میں اسلام کو دین قیم Perennial Religion کہا گیا ہے جو بنیاد ہے تمام ادیان
کی۔ اس کے بعد نبوت ہے جو ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ ایک حقیقت ہے ایک ابدی
حقیقت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور پھر عدل و امامت ہے۔ میں نے عرض
کیا تھا کہ یہ تمام دین ایک عہد ہے ایک commitment ہے کسی کے ہاتھ میں
اپنا ہاتھ دینا ہے تو دین کے معنی ہیں کسی سے عہد کر کے آپ اپنی زندگی یوں نہ گزاریں
کہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ آپ کسی کے سامنے جوابدہ نہ ہوں بلکہ اس
طرح گزاریں کہ آپ نے اپنی مرضی اور اپنے اختیار سے اپنے کو ایک تنظیم۔ Disc
ipline کا پابند کر لیا ہے۔ اکراہ سے نہیں کیا ہے کیونکہ دین میں اکراہ
نہیں ہے۔ کوئی جبر نہیں۔ آپ نے خود یہ Discipline قبول کیا ہے اور اپنی
زندگی کو اس کا تابع بنایا ہے۔

اب ان آیتوں کا جن کا ترجمہ میں نے خطبہ کلام میں پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے
جناب آدمؑ کا ذکر کیا ہے اور اس ذکر میں مصلحت یہ ہے کہ وہ انسان کے مقام کو
بتلاتا ہے کہ زندگی میں اس کا کیا مقام ہے۔ انسان کے متعلق گفتگو اور اس
کی حقیقت یہ ہر فلسفہ میں اہم مقام رکھتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ بتا رہا
ہے کہ مقصد میرا یہ ہے کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنا رہا ہوں۔ خلیفہ کے معنی ہیں

بعد میں آنے والا۔ ایک آدمی آتا ہے اس کے پیچھے آنے والا اس کا خلیفہ ہے۔
جب اللہ تعالیٰ اپنا خلیفہ بنا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا۔ خلیفہ کے دوسرے معنی ہیں اپنا بدل یا اپنا Substitute یعنی کوئی چلا گیا اور اپنی جگہ دوسرے کو کام سپرد کر گیا۔ اللہ کے ضمن میں یہ معنی بھی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اللہ کبھی معطل نہیں ہوتا۔

اللہ زمین پر اپنا خلیفہ بنا رہا ہے اور تیاری یہ ہے کہ آدم کو تمام اسما سکھا دیئے۔ یہ اسما بڑی چیز ہیں۔ کسی چیز کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کا صحیح نام جانتے ہوں، اور اس کی حقیقت آپ پر روشن ہو۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں۔ یہ کائنات جو اس نے خلق کی ہے۔ یہ سب انھی کا ظہور ہے۔ کسی شے پر اللہ تعالیٰ کے کسی نام کا اظہار ہوتا ہے کسی نام کی توجہ ہوتی ہے۔ اس میں وہی خصوصیت اور وہی سیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ شیطان بھی اللہ کی خلقت سے باہر نہیں ہے۔ اسی نے شیطان کو پیدا کیا۔ المتکبر اللہ کا نام ہے۔ شیطان نے غلطی یہ کی کہ اس کی توجہ جو اس نام کی طرف ہوئی تو وہ اپنے آپ کو متکبر سمجھ بیٹھا۔ تو اس طرح کی بلندی ہو یا پستی۔ اللہ تعالیٰ رفیق ہے اللہ تعالیٰ معز ہے اللہ پست کرنے والا ہے۔ اللہ رافع الدرجات ہے تمام کائنات اس کی مختلف شیون ہے۔ کل یوم ھوا فی شان یہ سب اس کی جھلکیاں ہیں۔ آدم کو اس نے تمام کے تمام نام سکھائے۔ اسں نام سکھانے کے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان میں علم کی صلاحیت آئی۔ اب وہ چیزوں کو دیکھ کر نام رکھ سکتا ہے۔ ان کی حقیقت کو پہچان سکتا ہے اور اہل معرفت اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ جو چیزیں خلاصہ کائنات ہیں یعنی ہمارے پنجتن پاک کے نور سے آدم کو متعارف کرایا گیا۔ بہر حال جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا جب تک آدم کو علم نہیں

دیا گیا۔ یہ علم وہ چیز ہے جس سے فرشتوں پر حجت قائم ہوئی کہ ہاں آدم اب اس لائق ہیں کہ ان کو سجدہ کیا جائے۔ یہ آپ اپنی تاریخ اور روزمرہ کی زندگی میں دیکھیے کہ جب انسان علم حاصل کر لیتا ہے تو کائنات کی تمام طاقتیں اس کے سامنے سجدہ کرنے لگتی ہیں۔ گویا خلیفہ کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کو بھیجا جا رہا ہے تمام اسماء کا علم دے کر۔ اللہ تعالیٰ کے جو صفات ہیں ان کا ظہور اس میں کرے۔ یہ عالم کبیر ہے اس کے مقابل میں انسان کو عالم صغیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ جو اپنا شعور رکھے گا اور اللہ کا شعور رکھے گا دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں کلام پاک کی رو سے اللہ کی نشانیاں ہیں یہ اپنی زبان اور اپنے طور پر اللہ کی تسبیح کرتی ہیں لیکن جو شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمایا وہ کسی اور میں نہیں ہے۔ جو بات اور جتنی بات جس کو بتا دی بس اسی حد تک اس کا علم ہے۔ فرشتوں پر تسبیح و تقدیس کا اثر ہے چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی انھی اسماء سے تسبیح کرتے رہے ہیں لیکن یہ انسان ہے جس میں تمام صلاحیتیں مرکوز کی گئی ہیں۔ پستی کی بھی بلندی کی بھی انسان کو آزادی دی گئی ہے اس کو اختیار دیا گیا ہے اس لیے کہ اس کو ذمہ داری دی گئی ہے جو کسی اور مخلوق کو نہیں دی گئی۔

تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا تو اب صورت یہ ہے کہ کلام پاک میں جو الفاظ آتے ہیں ان کا مفہوم تو کچھ اور ہوتا ہے مگر ان کا انطباق مختلف درجات میں ہوتا ہے۔ یعنی ایک معنی تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ ایک معنی یہ ہیں کہ وہ ملت جس پر اللہ کا پیغام ہوتا ہے اور علم حاصل کرنے والی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس زمین پر خلیفہ بنتی رہی یستخلف کا لفظ ہے یعنی زمین پر اس قوم کو خلیفہ بنایا۔ اور غور کرو تو اس قوم اور انسانیت کی جان و روح جو فرد ہوتی ہے۔ وہ فرد واحد اللہ کا خلیفہ ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کائنات کی تمام طاقتوں کا انسان کے سامنے سجدہ۔ جو یہ کہتے ہیں کہ امام خلیفۃ اللہ ہوتا ہے۔ وہ

پرکھ لیتے ہیں اور اس سے زیادہ سچی بات کوئی اور نہیں۔ جناب ابراہیم کے امتحانات لیئے گئے اور ان میں وہ پورے اترے۔ ان کے امتحانات یہ تھے کہ کس طرح وہ بتوں سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف رجوع ہوئے کس طرح انھوں نے تاروں کو سورج کو اور چاند کو دیکھا اور کس طرح وہ ان سب کے پیدا کرنے والے کی معرفت تک پہنچے۔ کس طرح وہ اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کی قربانی دینے کو تیار ہوئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کا امتحان لے لیا اور کچھ کلمات سے آزمالیا تو ان کو انسانوں کے لیے امام بنایا۔ قرآنی اصطلاح میں امام اور خلیفہ کے معانی مختلف نہیں۔ دونوں سے مراد بندوں اور اللہ تعالیٰ کے مابین ایک رشتہ ہے۔ جناب آدم کے لیے خاص طور سے خلیفہ کا لفظ اور جناب ابراہیم کے لیے امام کا لفظ اس لیئے آیا کہ آپ جناب ابراہیم سے ایک پوری نسل شروع ہوتی ہے۔ پوری ذریت شروع ہوتی ہے۔ امت کے لحاظ سے ان کو امام کہا گیا۔ جو مقام خلیفہ کا ہوتا ہے وہی مقام امام کا ہوتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں خلیفہ اور امام کے معنی مختلف نہیں۔ یہ فرق بعد میں ہماری زبان اور تاریخ کی اصطلاح میں ہوا ہے۔

جیسا میں نے کل عرض کیا تھا دین اللہ تعالیٰ سے ایک عہد ہے comitm ent ہے۔ ایک بیعت ہے اور صورت اس کی یہ ہے کہ ہم رسول کے اور رسول کے قائم کئے ہوئے اولوالامر کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ دین کے معنی اپنے آپ کو سپرد کردینا ہے۔ اپنے آپ پر ایک ڈسپلن طاری کرنا ہے۔ اپنی ذمہ داری پورا کرنا ہے اگر یہ خود سپردگی کا احساس نہیں ہے اگر یہ اطاعت قبول کرنے کی کیفیت نہیں ہے تو پھر دین شروع ہی نہیں ہوا۔ دین کی ابتدا ہی نہیں ہوتی۔ بیعت کے معنی سودے کے ہیں۔ ایک چیز دی جاتی ہے ایک چیز لی جاتی ہے۔ ایک چیز بیچی جاتی ہے اور ایک چیز خریدی جاتی ہے اور کلام پاک میں بھی یہی معنی ہیں جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے

کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کے جان اور مال خرید لئے اور انھوں نے اس کے بدلے میں رضائے الہٰی حاصل کرلی۔ یہ جو ہمارا نفس ہے ہماری جان ہے ہمارا مال ہے ان کا سودا کسی نہ کسی سے کرنا پڑتا ہے۔ کسی نے اپنا سودا اللہ سے کرلیا اور کسی نے شیطان سے کرلیا کسی نے ہوا و ہوس سے کرلیا۔ مگر سودا کرنا ضرور ہے۔ اور مومن اپنے اللہ اور اپنے رب سے سودا کرتا ہے۔ یہی مطلب رسول اور امام سے بیعت کرنے کا ہے

بیعت کے مختلف معنی کیسے پیدا ہوئے اور اس کی کیا صورت ہوئی اس کی صورت یہ ہے کہ حضور کو خداوند کریم نے صرف نبی ہی نہیں بنایا تھا بلکہ دنیاوی حکومت بھی عطا فرمائی تھی۔ یہ دنیاوی حکومت کوئی لازمی بات نہ تھی۔ اگر آپ انبیاء کے حالات پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت کم ایسے نبی تھے جن کو ظاہری حکومت بھی دی گئی تھی۔ یہ تو شاید اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس لئے ایک نمونہ دیا کہ نیکی اور طاقت ہمیشہ علیحدہ علیحدہ رہنے والی چیز نہیں ہیں بلکہ مل بھی سکتی ہیں۔ بیشک تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ طاقت عام طور پر corrupt یعنی بددیانت کردیتی ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ نیکی کے ذریعے حاصل کی ہوئی طاقت کو نیکی ہی بڑھانے اور پھیلانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور لفظ خلیفہ جس معنی میں استعمال ہونا شروع ہوا اسلامی تاریخ میں ماوردی (جو فلسفہ سیاست کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں)۔ یہ کہتے ہیں کہ خلیفہ ملک کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ آئین اور شرع کو رواج دے۔ قانون کی حکمرانی قائم کرے۔ نماز اور خطبہ کا انتظام کرے۔ زکوٰۃ اور خراج وصول کرے۔ حکومت کے جتنے فرائض ہیں ان کو سرانجام دے حدود کو قائم کرے۔ دار السلام کی سرحدوں کی حفاظت کرے بلکہ ان کو وسیع کرنے کی کوشش کرے اور نبوت کا اس سے کوئی تعلق نہیں حضور سرکار دوعالم کے بعد نبوت ختم ہوگئی۔ لیکن ملک کے انتظام امت کے انتظام کے لئے جو بے شک بہت ضروری امور ہیں ان کے لئے خلیفہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب امام کی تعریف امام حسینؑ کی زبان

سے سنتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قسم ہے میری جان کی امام وہ ہے جو حامل قرآن ہوتا ہے۔ وہ قرآن کا عامل ہوتا ہے۔ حامل قرآن کے معنی یہ ہیں کہ وہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقت بولتا ہوا قرآن ہوتا ہے اور عامل قرآن کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تمام حرکت اور سکوت قرآن کا آئینہ دار ہوتی یعنی اس کی تمام زندگی قرآن کی تفسیر بن جائے۔ وہ دنیا میں قسط وعدل قائم کرے۔ ظلم کی مخالفت کرے۔ امام وہ ہے جو حق سے مزین ہو۔ جس کی زینت سچائی ہو اور جس نے اپنے نفس کو رضائے الٰہی کا پابند کر دیا ہو۔ یعنی اس میں کوئی ہوا و ہوس نہ ہو۔ خود غرضی نہ ہو وہ نفسانی خواہشات پر دھیان نہیں دیتا بلکہ وہ کرتا ہے جو اللہ کی مشیت اور رضا ہوتی ہے۔ اس کے اور خدا کے درمیان سے نفس اور خودی کا پردہ ہٹ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہے تو امام وہ ہوا جو کار نبوت اور ہدایت کے سلسلے کو جاری رکھے وہ رسول کا وصی ہوتا ہے۔ اس کا وارث ہوتا ہے۔ اسی لئے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ امام کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں۔ یعنی اللہ کا ولی، نبی کا وصی اور وارث اور ملت کا مولا اور امیر۔

اب خلافت اور امامت کے درمیان جو فرق ہو گیا اس کو بغور دیکھیے اور سمجھ لیجیے۔ پہلا فرق تو یہ ہوا کہ اگر ملک ہے تو خلیفہ ہے۔ امام کے لئے ملک کی قید نہیں۔ کیونکہ وہ نبی کا وارث اور وصی ہوتا ہے اور نبی لازمی طور سے [illegible] حاکم نہیں ہوتا۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بطور انعام یہ بوجھ بھی نبی پر ڈال دے تو دوسری بات ہے ورنہ کار نبوت میں حکومت قائم کرنا شامل نہیں۔ خلیفہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ملک ہو اگر ملک نہیں تو خلیفہ نہیں۔ مگر امام کے لئے یہ شرط نہیں امام ہر حال میں امام ہے جس طرح نبی ہر حال میں نبی ہے خواہ اس کے پاس حکومت ہو یا نہ ہو۔ خواہ وہ اس قوم میں نبی بنایا گیا ہے جو کسی دوسری قوم کی غلام ہو۔ جیسے قوم

موسیٰؑ قوم فرعون کی غلام تھی۔ خواہ وہ حکومت کرنے والے حضرت سلیمان اور حضرت داؤدؑ جیسے ہوں یا وہ ایسے ہوں جن کا ملک اور حکومت سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ لیکن ہر حال میں نبی نبی اور امام امام رہتا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں بیعت کی کیفیت بھی مختلف ہے۔ رسول کے ہاتھ پر بیعت ایک حقیقت کو تسلیم کرنا ہے یعنی یہ کہنا کہ ہم اس بات پر ایمان لائے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ آپ اس کے رسول ہیں ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔ لیکن رسول کا رسول ہونا اور امام کا امام ہونا ہماری بیعت پر منحصر نہیں ہمارے بیعت نہ کرنے پر بھی رسول رسول رہے گا اور امام امام رہے گا۔ ہماری بیعت تو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ بے شک امام ہیں اس وجہ سے ہمارے سر آپ کے قدموں پر ہیں۔

اس کے برخلاف خلیفہ اپنی ... اختیار عوام کی کثرتِ آرا ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اگر اس کی بیعت عوام الناس نے کر لی تو وہ خلیفہ بنا اگر لوگوں نے بیعت نہ کی تو خلیفہ نہیں بنا۔ اب دونوں بیعتوں میں فرق واضح ہو گیا ہو گا۔ رسول اور امام بیعت کے ذریعے نہیں بنتے۔ بلکہ وہ رسول اور امام ہیں اور ان کی بیعت کے معنی ہیں کہ وہ انسان خوش نصیب ہیں کہ حقیقت کو جان لیا۔ اور اس کا اعتراف بیعت کی صورت میں کیا اگر جناب نوحؑ کی طرح چند افراد کے سوا اس کو کوئی ماننے والا نہ ہو تب بھی وہ اپنی جگہ اللہ کا پیغمبر اور اس کی جانب سے ہادی ہے جو مقام یا رتبہ لوگوں کے بیعت کرنے سے حاصل ہوتا ہے وہ لوگوں کی جانب سے بیعت فسخ کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ کسی رسول یا امام سے بیعت کر کے منسوخ کر دیں تو اس پر کیا اثر ہو گا وہ تو جو پہلے تھا وہ اب بھی ہے یہ صرف آپ ہی کی بدبختی ہو گی کہ پہلے جہاں تھے وہیں واپس آ گئے۔ مثال کے طور پر پہلا خطاب جو حضرت ابوبکر نے کیا وہ یہ تھا "لوگو! مجھے تم پر ولی اور حاکم

گیا ہے۔ حالانکہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں سیدھے راستے پر چلوں تو تم میرے ساتھ تعاون کرنا اور میری بات کو ماننا۔ اور اگر میں غلط راستے پر چلوں تو تم مجھ کو سیدھا کرنا تم مجھ کو سنبھال لینا۔ (عربی ترجمہ ہے درست کرنا سنبھالنا) یہ پہلا خطبہ تھا جو حضرت ابوبکر نے مسندِ خلافت پر بیٹھ کر دیا۔

حضرت عثمان کے قتل کے بعد لوگ حضرت علیؑ پر جھپٹ پڑے۔ مدینہ میں کسی کی حکومت نہیں ہے ایک ایسا Anarchy جیسا ماحول ہے لوگ ضد کر رہے ہیں کہ اس وقت کوئی صورت سوا اس کے نہیں کہ آپ اس خلافت کے بوجھ کو اٹھائیں اور خلیفہ بنیں۔ جناب امیر کنارہ کشی کی کوشش میں ہیں کیونکہ ان حالات میں خلافت سنبھالنا کانٹوں کی سیج پر بیٹھنے کے مترادف ہے۔ ملک میں زبردست انتشار ہے۔ اتنے زیادہ Factions بن چکے ہیں اور لوگوں کے ارادے اتنے بدلے ہوئے ہیں کہ ان کو سمونا مشکل ہے لوگوں کی طرف سے حجت قائم کی جارہی ہے۔ حضرت علیؑ کسی قسم کی لاگ لپیٹ والی گفتگو نہیں فرماتے آپ فرماتے ہیں کہ لوگوں تم کسی اور کی طرف رجوع کرو۔ اس سے جاکر التماس کرو۔ لیکن اگر تم مجھ سے یہ التماس کرتے ہو اور میں تمہارے اس التماس کو قبول کرتا ہوں تو پھر میں تم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند بناؤں گا جس کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ (یہ امامت کی زبان بول رہی ہے اور اس کام میں میں نہ کسی کی مخالفت کی پرواکروں گا۔ اور نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ کروں گا۔ اور نہ کسی عتاب کرنے والے کا خوف کروں گا (امام کا تعلق اللہ سے ہے اور وہ اسی کو جوابدہ ہے) اور اگر تم اس بات کو اس امر کو یعنی خلافت کو کسی دوسرے کی طرف لے جاؤ تو پھر میں ایسا ہی ہوں جیسے تم ہو۔ اور تم دیکھو گے کہ تم سے زیادہ میں اس کی بات کو سننے والا ہوں اور خیر خواہی کرنے والا ہوں گا۔ لیکن اگر یہ منصب تم ضد اور التماس کرکے میری طرف رجوع کرتے ہو تو میں تم کو خدا کے حکم کا پابند

کروں گا اور اس حکم خدا کو اور قرآنی تعلیم کو میں جانتا ہوں۔

امام حسینؑ پر لوگوں نے حجت قائم کی کہ ہماری ہدایت کے لئے آئیں۔ امامؑ ہدایت کرنے پہنچ گئے۔ اب لوگوں نے یہ ہدایت قبول کی کہ نہیں کی یہ وہ جانیں اور ان کا خدا جانے۔ لیکن امام ہدایت دینے پہنچ گئے اور اس شان سے امامت اور ہدایت کا فرض پورا کیا کہ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ تو اسی طرح حضرت علیؑ فرما رہے ہیں کہ تم لوگ یہ نہ سمجھنا کہ میں مصلحت کی بنا پر کسی شخص کو گورنر بنا رہنے دوں گا۔ اور اس کو یہ کرنے دوں گا اور وہ کرنے دوں گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اگر تم مجھے یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لئے مجبور کرتے ہو تو تم مجھ سے یہ توقع نہ کرنا کہ جس کو پالیسی یا مصلحت کہا جاتا ہے اس پر چلوں۔ میرا تو کام یہ ہوگا کہ میں اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلوں اور سرِ مو اس سے انحراف نہ کروں۔ اور میں کم از کم یہ تو دکھا دوں کہ ملتِ اسلامیہ صراطِ مستقیم سے کتنا ہٹ چکی ہے میں وہ معیار ہوں گا اور میں وہ معیار ہوں کہ جس کے ذریعے سے تاریخ بتائے گی کہ ملت اسلامیہ اپنے راستے سے کتنا ہٹ چکی ہے۔ اس لئے کہ امام کی جگہ یہ نہیں کہ وہ وقت کا غلام ہو۔ وقت کی مصلحتوں کا تابع ہو بلکہ امام صاحب زمانہ ہوتا ہے۔ اپنے وقت کا مالک ہوتا ہے۔ دنیا چاہے اسکو برداشت نہ کرسکے۔ لیکن جس وقت وہ ظاہری حکومت کے مقام پر ہے تو پھر اس کا رویہ وہی ہوگا جیسا کہ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا۔ ان دونوں بیانات پر غور کریں۔ یہ دونوں ~~~~ ابتدائی اور افتتاحی خطبات ہیں۔ جناب ابوبکر خلیفہ بنے ہیں اور اپنا موقف بیان کر رہے ہیں۔ دوسری طرف حضرت علیؑ کو ظاہری خلافت کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے اور وہ اپنا طریقہ کار بیان کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا حضرت علیؑ نے مصلحتوں سے کام نہیں لیا بلکہ سیدھے راستے کی نشاندہی کردی۔ معاویہ کو شام کی گورنری کی خواہش تھی جناب ابن عباس نے حضرت علیؑ سے کہا ذرا تھوڑا سا مضبوط ہو جائیے

اس کے بعد معاویہ کو معزول کیجیے گا لیکن آپ کسی ڈپلومیسی کے قائل نہ تھے۔ آپ
نے معاویہ کی معزولی کا حکم جاری کر دیا۔ آپ تمام حالات کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن
آپ دکھانا چاہتے تھے کہ جس وقت ملت بگڑنا شروع ہوتی ہے تو بڑے
سے بڑا آدمی یہ کر سکتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو adjust
کرے ورنہ ملت جس راستے پر چلنا شروع ہو جاتی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اور
جو تنزل کا راستہ ہوتا ہے اس پر وہ چلتی رہتی ہے، لیکن دنیا بدلی وہ خود صراط
مستقیم سے نہیں ہٹے۔ اور حضرت علیؑ کا ان الفاظ سے یہی مقصد تھا جو آپ
نے ضربت لگنے کے وقت فرمائے یعنی "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا" کامیابی
اور ناکامی اس میں دیکھی جاتی ہے کہ انسان کا مقصد کیا تھا اور اس مقصد میں
وہ کامیاب ہوا یا ناکام رہا۔ اب یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت علیؑ کی خلافت کا دور ناکام رہا
کیونکہ ان کے عہد میں خانہ جنگی ہوتی رہی۔ یہ ہوتا رہا اور وہ ہوتا رہا۔ عزیزو اگر
حضرت علیؑ نے خلافت اس وعدے کے ساتھ سنبھالی ہوتی کہ میں تمہاری حکومت
کو مضبوط کر دوں گا۔ اس کی سرحدوں کو بڑھا دوں گا تمام باہمی اختلافات
دور کر دیئے جائیں گے تو پھر ناکامی ہوتی لیکن اگر کوئی یہ کہہ کر آ رہا ہے کہ میں تم
کو اللہ کا راستہ دکھانے کے لئے آ رہا ہوں اور تم اسی سے ناپ لینا اور
اندازہ کر لینا کہ ملت میں اتنا تحمل رہا کہ نہ رہا۔ لفظ تحمل کا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ
تھے کہ میں تم کو حکم الٰہی کا متحمل بناؤں گا کہ تم اس کو قبول کرو اور اسی وجہ سے
آپ نے فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی راستے میں کتنے ہی frust-
rations آئے کتنی مشکلیں پڑیں۔ کتنی مزاحمتیں آئیں۔ کبھی کبھی یہ خیال
بھی آتے کہ تھوڑے سے پیسے دے کر فلاں آدمی کو اپنی طرف کر لیا
جائے وہ بڑے کام کا آدمی ہے جو معاویہ دے رہا ہے اس سے زیادہ دے

کو اپنی طرف کر لیں یا چونکہ حاکم شام بہت طاقت پکڑ گیا ہے اور مخالفت پر کمربستہ ہے اس کی برائیوں سے چشم پوشی کرلی جائے۔ حضرت علیؑ نے یہ کچھ نہیں کیا اس خدا کی تعریف ہو اور اس کا شکر ادا کیا جائے جس نے ابوتراب کو اس قابل کیا کہ اس کے راستے میں مشکلات کے پہاڑ آئے لالچین آئیں۔ خوف کے مقامات آئے لیکن اس کا قدم صراط مستقیم سے یک سر مو ادھر ادھر نہیں ہوا۔ اس سے بڑی کامیابی کیا ہوسکتی ہے کہ ایسی آگ سے انسان سلامتی سے گزر جائے۔

عزیزان گرامی یہ تو تھی باپ کی کامیابی۔ اب ذرا بیٹے کی کامیابی ملاحظہ ہو۔ دو متضاد مقاصد کا ٹکراؤ تھا۔ یزید کا مقصد اور اس کی سیاست کا اہم ترین تقاضا یہ تھا کہ نواسہ رسولؐ حسینؑ ابن علیؑ اس کی بیعت کرے تاکہ اس کی حکومت قانوناً جائز ہو جائے اور جو کچھ وہ کرے اس پر نواسہ رسولؐ کی توثیق سمجھی جائے۔ اور حسینؑ کی امامت اور سیاست کا مقصد یہ تھا کہ فاسق و فاجر کی بیعت کسی قیمت پر نہ کی جائے۔ چنانچہ کربلا کے میدان میں یہ ٹکراؤ ہوتا ہے۔ حسینؑ کی پہلی کامیابی یہ ہے کہ خود یزید کے رسالہ کا نامی کمانڈر حرؑ حسینؑ کی طرف آجاتا ہے اور پہلا شہید ہوتا ہے۔ دوسری کامیابی یہ ہے کہ احباب عزیز اقارب قتل کر دیئے گئے اور خود کا سر تن سے جدا ہو گیا مگر بیعت نہ کی اور تیسری کامیابی یہ ہے کہ امام زین العابدینؑ یعنی حسینؑ کے فرزند ایک رسی سے بندھے بیڑیاں پہنے قیدی کی حیثیت سے یزید کے سامنے کھڑے ہیں اور یزید میں اب جرأت و ہمت نہیں کہ ان سے بیعت طلب کرے۔

لب جنگجو کی صدا بن گئی بیتھری کی تکبیر — رہ گئے اپنا سا منہ لے کر یزن اور بجگیر
ایک ہی واقعہ تھا ایسا سریع التاثیر — کہ ادھر چند اسیر اور ادھر لاکھ شریر

بار دیگر طلب ذلت بیعت نہ ہوئی
پھر اس انسان کو دہرانے کی ہمت نہ ہوئی

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ تمام حمد اللہ کے لئے ہے جو مالک الملک ہے۔ جو ملک بخشتا ہے جس کو مناسب سمجھتا ہے اور ملک لے لیتا ہے جس سے مناسب سمجھتا ہے۔ جس کو مناسب سمجھتا ہے اس کو عزت دیتا ہے اور جس کو مناسب سمجھتا ہے اس کو ذلت دیتا ہے۔ ملک اس کے ہاتھ میں ہے عزت اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی ہے کہ جو دن سے رات کو نکالتا ہے رات سے دن کو نکالتا ہے۔ موت سے زندگی کو نکالتا ہے اور زندگی سے موت کو نکالتا ہے اور جس کو دینے پر آتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

اور ہمارا درود ہو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس ذات گرامی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ لوگوں کے لئے خوش خبری لے کر بھیجا اور لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ سراج منیر یعنی روشن چراغ بنا کر بھیجا۔ وہ کہ جس نے اللہ کے حکم سے اور اللہ کے علم سے یہ بات بتائی کہ لوگو اگر تم کو اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو میرا اتباع کرو گے اور اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ ابتدا اس بات سے ہوگی کہ تمہارے دلوں میں اللہ کی محبت ہے تم اس سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا راستہ اتباع رسول ہے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ تم اللہ کے محبوب بن جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اسی کی اطاعت کا حکم ہے اور اسی کے اتباع کا حکم ہے اطاعت اور اتباع میں فرق ہے۔ اطاعت کے معنی میں حکم کا ماننا۔ اتباع کے معنی ہیں کسی کے پیچھے چلنا۔ اطاعت کسی حکم کی ہوتی ہے۔ اتباع کسی اسوہ کا کسی نمونہ کا کسی انسان

کا ہوتا ہے۔

اور ہمارا اسلام ہو ان آئمہ اطہار پر جنہوں نے اتباع رسول کا حق ادا کر دیا۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ اتباع کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ وہ اہل بیت محمدؐ کہ جن کی شان میں جناب امیر المومنینؑ نے خود فرمایا کہ یہ وہ ہیں کہ جو اسرار رسالت کے راز دار ہیں۔ یہ ہیں وہ کہ جو رسالت کے امر کے اس اتھارٹی کے جائے پناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ودیعت ہوتی تھی۔ اس لئے کہ عزیزو امر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے امر دیتا ہے اور جس کو وہ امر دیتا ہے وہی اولالامر ہوتا ہے اور اس امر کی جائے پناہ اہل بیت رسولؐ ہیں۔

امر کے سلسلے میں ایک بات عرض کروں کہ ہدایت امر سے ہوا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اذن ہی سے ہدایت ہوا کرتی ہے۔ مختصری ایک بات دیکھ لو۔ یہی خطبات ہیں۔ یہی قرآن پاک ہے ان کو جس وقت دہرایا جاتا ہے تو ان کا وہ اثر نہیں ہوتا جو اثر اس وقت ہوتا تھا جب وہ رسول اور آئمہ کی زبان سے جاری ہوتے تھے۔ ایک آدمی کی زبان میں زیادہ اثر ہوتا ہے دوسرے کی زبان میں وہ اثر نہیں ہوتا۔ تو عزیزو یہ سمجھو کہ اتھارٹی ہمیشہ کسی حکومت کی ہوتی ہے اس کو یوں دیکھیے کہ ایک آدمی جو حکومت کی اتھارٹی کے ساتھ آپ سے کچھ کہتا ہے تو آپ ماننے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر وہی بات وہی حکم کوئی ایسا آدمی کہے جس کے پاس کوئی امر یا اتھارٹی نہ ہو تو آپ کو برا معلوم ہوگا۔ فرق یہ ہوا کہ اگر کسی کے پاس حکومت کی اتھارٹی موجود ہے تو بڑے سے بڑا آدمی اس چھوٹے سے چھوٹے آدمی کی بات مانے گا۔ وہ جس کو ہماری طرف چپراسی کی چپراس لگی ہوئی کہتے ہیں۔ وہ چپراس حکومت کی نشانی ہے کہ حکومت نے اس چپراسی کو اتھارٹی دی ہے۔ اگر وہ چپراسی آپ کے پاس وارنٹ یا سمن لے کر آئے تو آپ اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ٹریفک کا ایک سپاہی جو اشارہ دیتا ہے

تو بڑے سے بڑا آدمی اس کو مانتا ہے کیونکہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ایک بڑے حاکم کے حکم سے کر رہا ہے۔ اسی طرح ہدایت جو ہوتی ہے اور زبان میں جو اثر ہوتا ہے وہ بھی اسی بات سے ہوتا ہے وہ بھی اسی بات سے ہوتا ہے۔ جتنی انسان میں صداقت ہوتی ہے جتنا وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے اتنا ہی اس کی زبان میں اثر ہوتا ہے۔ اتنا ہی لوگ اس کو بجا سمجھتے ہیں۔ تو یہ ہیں امر کے معنی۔ اور جناب علی فرماتے ہیں کہ اہل بیت محمدؐ کے متعلق کہ یہ رسولؐ کے امر کے جا و پناہ ہیں۔ وہ سلطان وہ طاقت اور وہ اثر کہ جو اللہ تعالیٰ نے رسول کو دیا تھا اس کی جا و پناہ یہ ہیں۔ اس گھر والے صاحب الامر بنے وہ لوگ امر کے مالک ہوں گے۔ تو اہل بیت محمدؐ وہ ہیں جو رسالت کے رازوں کے امین ہیں۔ خزانہ دار ہیں۔ جو علم نبوت کی ودیعت گاہ ہیں جو حکمت کے ملجا اور ماوا ہیں۔ یعنی یہیں حکمت پیدا ہوتی یہیں حکمت نے پرورش پائی ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور اس کی کتابوں کے وارث ہیں۔ وارث آدم ہیں وارث نوحؑ ہیں۔ وارث ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ بھی ہیں۔ اس لئے کہ حقیقت کا ایک سلسلہ چلا آرہا ہے اور جو کتاب ان کے پاس ہے وہ مہیمن ہے وہ نگہبان ہے تمام دوسری کتابوں کی حضرت علیؑ مزید فرماتے ہیں کہ اہل بیت محمدؐ وہ ہیں کہ جب اسلام کی کمر میں طاقت نہیں تھی اور وہ جھکی ہوئی تھی تو انھوں نے اس کو سیدھا کیا اور طاقت پہنچائی اور جس وقت اس کے بازوؤں میں لرزہ تھا اور بے طاقت تھے تو انھوں نے ان کو مضبوط کیا۔ یہ خود اسلام کے بازو ہیں۔ اسلام کی کمر ہیں۔

عزیزان گرامی۔ اہل بیت محمد کی شان میں یہ الفاظ امیر المومنین کی زبان کے ہیں کل اپنی گفتگو میں میں نے کچھ خلافت اور امامت کا فرق بتایا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن پاک میں تو خلافت اور امامت تقریباً ہم معنی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں یہ دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحیں ہوگئیں اور معنی بھی بدل گئے۔ میں نے ان کا فرق بھی ظاہر

کر دیا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ خلافت کی بیعت کیا ہے اور امامت کی بیعت کے کیا معنی ہیں۔ میں نے رسول کی بعثت کا مقصد بھی بیان کر دیا ہے یعنی ان تمام باتوں کے علاوہ جس سے حکومت حاصل ہوتی ہے۔ ان تمام پستیوں ۔ بلندیوں، تلخیوں اور ترشیوں سے قطع نظر جو زمانہ میں چلتی رہتی ہیں اور زمانہ کی ہوس کاریاں ہیں۔ رسالت کا جو خصوصی کام ہے جو اس کا essential function ہے اس میں کوئی شریک نہیں۔ اگر ہمارے رسول بھی دنیاوی حاکم بھی تھے تو دنیاوی حاکم بہت لوگ ہوتے ہیں لیکن رسالت کا جو انفرادی اور غیر مشترک کام یعنی essential and exclusive function جس کے بغیر رسالت رسالت نہیں وہ ہے تلاوت آیات، تزکیہ نفس۔ کتاب و حکمت کا علم اور تعلیم۔ دنیا سے کفر کی تاریکی دور کرنا اور دین کی روشنی پھیلانا اور لوگوں کے قلوب کو منور کرنا انسان کی زندگی کو بہتر بنانا اور لا متناہی ممکنات میں ان کو کھلتے ہوئے انسان کو اس راستہ پر چلانا جس کی منزل اللہ ہے۔ یہ ہے کار رسالت۔ خواہ دنیاوی حکومت ہو یا نہ ہو۔

اب عزیزو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امامت اور دنیاوی حکومت کا کیا تعلق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں اگر غور کیجیے تو دنیا کے لئے فلاح۔ بہبود اور سعادت تو اسی میں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ دنیا کی ہدایت کا امر فرمائے وہی دنیا کا حاکم بھی ہو وہی اولامر بھی ہو کیونکہ صحیح مقام اس کا وہی ہے۔ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے کہ جب وہ لوگ جہاد پر آمادہ ہوئے تو حضرت شمعون Samuel نبی کے پاس گئے اور ان سے عرض کی کہ ہم جہاد کرنا چاہتے ہیں تو ہم پر کوئی سردار یا بادشاہ مقرر کر دیجیے۔ تو حضرت شمعون نے کہا کہ میں اللہ کے حکم سے تم پر طالوت Saul کو مقرر کرتا ہوں۔ اب عام طور سے اللہ تعالیٰ جس کو مقرر کرتا ہے وہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ اللہ کا معیار کچھ اور ہوتا ہے اور بندوں کا معیار کچھ اور ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے کہ وہ اس بات کو بہتر جانتا ہے کہ اپنی نبوت کو اور اپنی ولایت کو کس جگہ قرار دے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی بنی اسرائیل نے خدا کے نبی پر اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ طالوت کو جو مقرر کر دیا گیا تو اس کے پاس نہ دولت ہے نہ کوئی اور خوبی ہے۔ ہمارے درمیان تو بہت سے بڑے بڑے آدمی موجود ہیں۔ نبی نے جواب دیا کہ نہیں خدا نے طالوت ہی کو تم پر حاکم مقرر کیا ہے کیونکہ وہ جسم اور علم دونوں میں تم سب سے بہتر ہے جسم کے معنی ہوتے ہیں means physical یعنی جسمانی طاقت کیونکہ اس زمانے میں طاقت کا معیار جسم تھا۔ طالوت جسم بھی رکھتا ہے اور علم بھی جس سے وہ تم کو آگے بڑھائے گا اور تمہاری رہبری کرے گا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سرداری کے لیے پہلی شرط علم ہے اور دوسری چیز جسمانی صلاحیت ہے کہ وہ لوگوں پر حکومت کر سکے اور ان کی رہبری اور راہ نمائی کر سکے۔ تو حاکم کا تقرر جو کیا وہ نبی نے کیا اور یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے اس کو مقرر کرو۔ تو بہتر یہی ہے کہ دنیاوی حکومت دینی ہدایت کے تابع رہے۔ اس کی رہنمائی میں رہے۔ اب عزیزو حضور سرور کائنات نے اپنا وصی جو مقرر کیا وہ بھی اللہ کے حکم سے کیا۔ اپنی زندگی کے آخری سال میں آخری حج سے واپسی پر ایک بیابان میں (دشتِ غدیر) اونٹوں کے کجاوں کا ایک منبر بنایا اور اس پر بیٹھ کر حضور نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا میں تمہارے نفسوں سے زیادہ اولیٰ نہیں ہوں۔ کیا تم اپنے نفس کے مقابلے میں میرے حکم کو ترجیح نہیں دو گے۔ اس لیے کہ رسولؐ کا مقام یہی ہے۔ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ نفس اور خود غرضی کا شائبہ ضرور ہوتا ہے۔ اور اس شائبہ کو دور کرنا اور اپنے نفس کو حکم الٰہی کا تابع کرنا ایمان کا راستہ ہے۔ مومن کا قرینہ ہے۔ جتنا وہ نفسانی خواہشات کو دور کرتا

جائے گا۔ جتنا اپنے آپ کو اللہ کا مطیع کرتا جائے گا اتنا ہی زیادہ وہ ایمان میں بڑھتا جائے گا۔ اور رسول کا مقام ہماری جان۔ ہمارے مال۔ ہمارے عزیزوں سے اور کتاب اللہ کے مطابق ہمارے ماں باپ سے زیادہ بلند ہے تو پہلے آپ نے دریافت کیا کہ کیا میں تمہارے نفس سے اولیٰ نہیں ہوں کیا میں تمہارا مرجح نہیں ہوں زیادہ ترجیح مجھے نہیں ہے اور لوگوں نے اس بات کی شہادت دی کہ بے شک آپ رسول ہیں۔ آپ کا مقام یہی ہے کہ آپ ہمارے نفس سے اولیٰ ہیں۔ تب حضور نے فرمایا کہ جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔ عزیزانِ گرامی ایک عام غلط فہمی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک بادشاہ اپنا جانشین مقرر کرتا ہے تو یہ بھی اسی طرح ایک جانشینی کی بات ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایک ذیلی بات ہے۔ ایک بادشاہ کی طرح آتی ہے بڑی بات جو ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص یہ وصیت کر رہا ہے وہ بادشاہ نہیں ہے یہ ایک نبی وصیت کر رہا ہے اور نبی اس معاملے میں وصیت کر رہا ہے جو اس کا کام ہے۔ جو نبی کی خصوصیت ہے۔ اور اس کے بعد یہ تو لوگوں کی سعادت ہے اگر وہ اس کو وہ مقام دیں جو نبی کا مقام تھا اور جو نبی کی طرح ان کے نفوس پر اولیٰ ہو۔ اور یہاں مولیٰ کے معنی بھی صاف ہو گئے۔ یعنی وہ شخص جس کو آدمی اپنے نفس پر ترجیح دے تو یہ معاملہ محض بادشاہت اور حکومت کا نہیں تھا بلکہ یہ معاملہ کار ہدایت کا لوگوں کی امامت کا تھا۔ اسے لوگوں کو سیدھے راستہ پر چلانا تھا۔ وہ قرآن ناطق تھا وہ علم و حکمت اور امر کا وصی اور وارث تھا اب یہ لوگوں کی سعادت ہے۔ اگر یہ شخص ان کا بادشاہ بھی بنتا ہے۔ اگر لوگ اس کو بادشاہ بنانے کے خلاف ہیں تو یہ لوگوں کی بدبختی ہے۔ ورنہ اس کا مقام وہ ہے جو امام کا ہونا چاہیے۔ یعنی جو وارث ہے محمد مصطفیٰؐ کا اور اس کار خاص کا جس

کے لیے اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰؐ کو دنیا میں مبعوث کیا تھا۔

اب یہ دیکھئے کہ ہمارے آئمہ کا حکومتوں سے کیا تعلق رہا جس وقت حضور نے دنیا سے پردہ پوشی کی تو اس وقت ان کے عہد میں جو ملت تھی اس میں مختلف گروہ تھے ۔عرب کا معاشرہ قبائلی معاشرہ تھا۔ اور قبائلی معاشرے کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی پہلی وفاداری اپنے قبیلے سے ہوا کرتی ہے۔ حضور نے قبیلوں کو مٹایا نہیں بلکہ ان کو بتایا کہ صحیح مقام یہ ہے کہ قبیلے تمہاری شناخت Identification کیلئے ہیں ورنہ تم میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں ہے ۔رسول اللہ نے جب دنیا سے پردہ پوشی کی تو انصار کو یہ خوف تھا کہ کہیں ہم بالکل مغلوب نہ ہو جائیں ۔انھوں نے خلافت کے لیے کوشش کی لیکن قریش کا گروہ group زیادہ طاقتور تھا جس میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عبیدہ بن جراح جیسے لوگ زیادہ نمایاں تھے۔ ان لوگوں نے آپس میں جس طرح بھی ہوا یہ طے کر لیا کہ خلافت بہرحال حضرت ابوبکر کو دی جائے ۔اب ان تفصیلات میں جانے کے بجائے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور اس کے بعد کیا ہوا۔ ہم کو محض یہ دیکھنا ہے کہ حضرت علی کا رویہ attitude اور تعلق کیا رہا ۔پہلی بات یہ ہے کہ بنی امیہ کا گروہ group بہت طاقتور تھا۔ لیکن چونکہ وہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے ۔اس لیے اسلامی معاشرے میں ابھی ان کی کوئی حیثیت یا Pos-ition نہ تھی ۔ فتح مکہ سے قبل حضرت عثمان اسلام لا چکے تھے اس گروپ یعنی بنی امیہ کا سردار ابوسفیان تھا۔ وہ سب سے پہلے حضرت علی کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یا علی لوگوں نے تمہارا حق نہیں پہچانا ۔تمہارا حق مار لیا ہے ۔یہ تم کیا کر رہے ہو۔ جو خاموش بیٹھے ہو۔ صرف تمہارا اشارہ چاہیے

خدا کی قسم مدینہ کی گلیوں کو سواروں سے بھر دوں گا" ابو سفیان بے شک یہ کر سکتا تھا۔ وہ بڑے مضبوط اور طاقت ور گروہ کا سردار اور سربراہ تھا۔ لیکن حضرت علیؑ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا "ابو سفیان۔ تو کب سے اسلام کا ہمدرد ہو گیا" اب مکہ اور بنی امیہ کے اس بڑے سردار کو اپنا مقام بنانا تھا۔ یہ جا کر دوسری پارٹی میں شامل ہو گیا اور وہاں اس کو بڑا مقام بھی مل گیا۔ بہر حال اس واقعہ سے صاف ظاہر تھا کہ حضرت علیؑ کا رویہ اسلام کی بہبود پر مبنی تھا۔

اور دوسری بات وہ ہے جو حضرت سلمان فارسی نے بتائی جو حضرت علیؑ کے گھر کی بات تھی اور وہ بات بہت عبرتناک اور نصیحت آموز ہے جناب فاطمہؑ کے دل پر یہ بات بہت شاق تھی کہ حضور اکرم کی زندگی میں جو عزت اس گھرانے کو حاصل تھی اور جس طرح نماز پڑھنے مسجد جاتے ہوئے حضور اکرم سلام کرتے ہوئے جاتے تھے کہ اہلبیت نبوت میرا سلام ہو تم پر۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ گھر والے بیدار ہوتے تھے کیونکہ سوتے ہوئے لوگوں پر کوئی سلام نہیں بھیجتا اور اب اسی گھر کو درخور اعتنا نہیں سمجھا جا رہا ہے اور ان کے صدمے کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جو آپ اکثر فرماتی تھیں "کہ بابا آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد مجھ پر ایسے صدمے گزرے کہ اگر وہ روشن دنوں پر ہوتے تو وہ سیاہ ہو گئے ہوتے" یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ تو اب جناب فاطمہؑ حضرت علیؑ سے کہہ رہی ہیں "اے ابو الحسن تم کیا دیکھتے ہو۔ یہ اسلام کا معاملہ ہے یہ تمہارے حق کا معاملہ ہے۔ یہ دین کی ضرورت کا معاملہ ہے تم خیبر کو فتح کرنے والے۔ خندق کو فتح کرنے والے اور کتنے معرکے سر کرنے والے ہو۔

تم اس طرح خاموش بیٹھے ہوئے ہو۔ تم کچھ نہیں کہتے۔ حضرت علی خاموش گردن جھکائے بی بی سیدہ کی باتیں سن رہے ہیں۔ جناب فاطمہ فرما رہی ہیں کہ کیا اسلام کی بہتری کے لیے، اپنے حق کے لیے کچھ نہ کرو گے۔ تم دیکھتے نہیں کہ کیا ہو رہا ہے تم کیوں کھڑے نہیں ہوتے۔ تھوڑی دیر میں مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ علیؑ نے کہا اللہ اکبر۔ اور اب گردن اٹھا کر کہا کہ بنتِ رسولؐ کیا تم چاہتی ہو کہ یہ آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ یہ حضرت علیؑ کا جواب تھا۔

عزیزو! یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں۔ یہ نہ سمجھا کہ یہ اختلاف کی بات ہو رہی ہے بلکہ جناب امیر المومنین کا حق ہے کہ وہ اس بات پر احتجاج کریں۔ اسلام کی بہتری اسی بات پر ہے لیکن دوسری مصلحت اسلام کے لیے کیا ہے اور اگر آپ اپنے حق کے لیے اٹھے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے حضرت علیؑ اپنے حق کو قربان کر رہے ہیں۔ جناب سیدہ کی آنکھوں میں اس جواب کے بعد آنسو آ گئے، مگر آپ خاموش ہو گئیں۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر اس لیے کیا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ جناب امیر کا رویہ حکومت کی طرف کیا رہا۔ جن لوگوں نے یہ حکومت حاصل کی انھوں نے کچھ دعوے کیے مثلاً "ہماری خدمات اسلام کے لئے بہت تھیں ہمیں حضور سے نزدیکی اور قربت حاصل ہے۔" یہ دو دعوے سب سے بڑے تھے۔ جناب امیر المومنین نے ان دونوں باتوں کا بار بار جواب دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قربت کا جہاں تک تعلق ہے تو تم شاخوں کو تو پکڑتے پھرتے ہو اور جڑ کو چھوڑتے ہو۔ اور جہاں تک اسلام کے علم اور خدمات کا تعلق ہے تو میری خدمات جو کچھ ہیں وہ تم

کو معلوم ہیں۔ جو بنیادیں تمہارے دعووں کی ہیں ان کا اطلاق مجھ پر زیادہ
ہوتا ہے اور وہ باتیں مجھ پر زیادہ پوری اترتی ہیں۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تمام کی تمام نہج البلاغہ کو دیکھ جایئے
کسی جگہ آپ نے اس حجت کا ذکر نہیں کیا کہ تم بھول گئے کہ تم نے ہی تو مجھ کو
مبارک باد دی تھی اور دشت غدیر میں تمہارے سامنے ہزاروں آدمی
موجود تھے اور کیا محمد مصطفےٰؐ نے مجھے تم سب کا مولا نہیں بنایا اور
کیا تم نے مجھے مبارک باد نہیں دی۔ یہ بات امیرالمومنین کے خطبات میں
کہیں نہیں ملتی باوجودیکہ اس سے زیادہ مستند کوئی بات نہیں اس لیے
کہ جتنے طریقوں سے یہ حدیث آئی ہے۔ بہت کم حدیثیں آئی ہیں اور اس
حدیث کی یہ شان ہے کہ سالہا سال کے بعد جس وقت کوفہ میں حضرت علیؑ
خلیفۂ ظاہری کی حیثیت سے نماز جمعہ کے بعد خطبہ دے رہے ہیں اور اپنے
فضائل بیان کرتے ہیں تو فرماتے ہیں "تم میں سے بھی تو کچھ لوگ اس وقت
ہوں گے جو دشت غدیر میں موجود ہوں گے۔ جہاں میرے بھائی رسولؐ خدا
نے یہ بات فرمائی تھی کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے" اور
اس واقعہ کے تقریباً تیس برس بعد بھی اٹھارہ آدمی ایسے موجود تھے
جو کھڑے ہوئے اور شہادت دی کہ خم غدیر میں ہم بھی تھے جب
رسول خدا نے آپ کو مولا قرار دیا تھا۔

تو دیکھئے جناب امیر دوسروں کے دعووں کا جواب دیئے جاتے
ہیں لیکن اس بات کا اظہار نہیں کرتے کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ
اس لیے کہ ولایت اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہوتی ہے اور وہ مابہ النزاع
[illegible] بات نہیں ہوتی۔ اس کو تو جو مانے اس کی سعادت

ہے اور جو نہ مانے اس کی محرومی ہے۔ کوئی نبی نہیں کہتا کہ یہ ووٹ، رائے شماری کیوں ہو رہی ہے۔ میں نبی ہوں تم کیسے بنتے ہو۔ اس لیے کہ نبوت ما بہی النزاع امر نہیں اور نہ امامت ما بہی النزاع امر ہے نہ اس پہ کوئی جھگڑا ہوتا ہے۔ نبی کہتا ہے میں نبی ہوں۔ آپ مانیں تو سعادت نہ مانیں تو شقاوت، امام کہتا ہے میں امام ہوں۔ مجھے رسول نے امام مقرر کیا ہے لیکن وہ امامت کو حکومت کے جھگڑے سے منسلک نہیں کرے گا اس لیے کہ امامت کا مقام حکومت سے بہت بلند ہے۔ تمام نہج البلاغہ دیکھ جائیے حضرت علیؑ نے خلافت پر اپنا حق چھپایا نہیں ہے اس کا اظہار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میرا حق مارا گیا ہے لیکن وہ استدلال نہیں دیتے جو ہم لوگوں کے نزدیک سب سے بڑا استدلال ہے۔ اس لیے کہ ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مولا کی بات بادشاہ کا جانشین بننے کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی جانشینی نبوت کی ہے۔ خلافت والی جانشینی تو ایک ذیلی بات ہے۔ نبوت نے امامت کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

تو اب یہ جو قبائل بنے تو اس کی کیا صورت ہوئی۔ یعنی جس کو اسلام کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں میں ایک بات عرض کر دوں کہ نازیبا الفاظ کا استعمال میں بھی برا سمجھتا ہوں لیکن یہ بات بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر قوم اپنی تاریخ کو سمجھے خاص طور سے مسلمان قوم جس نے اپنی تمام تاریخ کو Romanticize کر رکھا ہے اور ایک خواب و خیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ قوم میں خود تنقیدی اور اپنے آپ کا شعور پیدا ہو۔ کبھی کم از کم کچھ سوالات ضرور کر لیے جائیں کہ جس زمانے کو ہم عہد زریں کہتے ہیں کیا واقعی وہ عہد زریں تھا

وہ کیسا عہد زریں تھا جس میں تین خلفا کو اپنی طبعی موت مرنا نصیب نہ ہوا
اور یہ کیا عہد زریں تھا جس میں خود مدینہ میں اتنا بڑا فتنہ اور فساد ہوا کہ لوگوں نے
خلیفہ وقت کو اس کے گھر کے اندر گھس کر قتل کر دیا۔ کبھی تھوڑی دیر کے
لیے ان حالات پر اپنی تاریخ پر ضرور سوچنا چاہیئے۔ منہ پر نقاب ڈال کر نہیں
بیٹھا جا سکتا۔ اپنے آپ کو پہچاننا ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ہم سے کہاں کمزوری
ہوئی ہے۔ کون سی بات مضبوط ہے کون سی روایت چلنا چاہیئے۔ یہ اپنے آپ
کو دانستہ طور پر غفلت میں رکھنا ہے تو وہ حکومتیں جو جبریہ قائم ہوتی ہیں
ان میں اسی قسم کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ تو اس عہد زریں میں جو قبائل
کا گٹھ جوڑ Alliance ہوا وہ اس طرح ہوا کہ بنی امیہ جا کر قریش کے اس
گروہ سے مل گئے جو Elite یا سربر آوردہ تھا۔ اس کے نتیجے میں شام
کی حکومت ان کو مل گئی۔ اور اس طرح سے ان کا ایک مقام ہو گیا۔ حضور
رسول اکرمؐ اپنے آخری سالوں میں یہ کرتے تھے کہ لوگ جوق در جوق مسلمان
ہو رہے تھے اور حضور مدینہ کے مسلمانوں کو ان قبائل میں بھیجتے تھے تاکہ تبلیغ
اسلام کریں اور ان کو دینی تعلیم دیں۔ قبیلوں کے سربراہ مدینہ آتے تھے۔
وہاں مسلمانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور معاشرہ کو دیکھتے تھے اور اسلامی اقدار سمجھتے تھے۔
اور پھر واپس جاتے تھے۔ اس طرح دو طرفہ آمد و رفت تھی۔ ٹریفک
تھی۔ مسلمانوں کا ان کی طرف جانا اور قبائل کے سرداروں کا مدینہ آنا اور
مسلم معاشرے میں رہنا یہ پروگرام چل رہا تھا۔ قرآن پاک میں خود اللہ تعالیٰ
نے فرمایا کہ یہ لوگ اسلام لے آئے ہیں لیکن ایمان ابھی ان کے حلق سے
نیچے نہیں اترا ہے اب حضور کے بعد یہ پروگرام تو ہو گیا بند اور فتوحات
کا پروگرام شروع ہو گیا۔ شام میں یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ مدینہ کے

وہ لوگ جنھوں نے اسلام کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور جو اسلام کو کچھ جانتے تھے وہ شام جاتے اور وہاں کے لوگ مدینہ آتے ہاں وہ مسلمان پہنچے جو فتحِ مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور جس کے ڈیڑھ برس کے اندر ہی حضورؐ کا انتقال ہو گیا یعنی شام وہ لوگ پہنچے جن کو مسلمان ہوئے صرف ڈیڑھ سال ہوئے تھے۔ اور جو اسلام کو صحیح طریقے سے سمجھے بھی نہ تھے اور ایسے لوگ شام کے حاکم بنا کر بھیج دیئے گئے اور اس طرح بنی امیہ کا ایک مقام قائم کر دیا گیا اور انصار کا مقام کیا تھا۔ وہ حضورِ اکرمؐ کے عہد کے ایک چھوٹے سے واقعہ سے ظاہر ہو جائے گا۔ فتحِ مکہ کے بعد کوئی چھوٹی سی جنگ تھی۔ اس کا مالِ غنیمت آیا۔ اب جو لوگ حال ہی میں مسلمان ہوئے تھے ان کو تالیفِ قلب کے لیے کچھ رقم دی جاتی تھی تاکہ ان نئے مسلمانوں کی آبادکاری Rehabilitation ہو سکے اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ مسلمان ہونے سے وہ خسارہ میں رہے۔ اس لیے اس مالِ غنیمت سے ان کو دیدیا گیا۔ مدینہ کے کچھ نوجوانوں کو خیال آیا کہ ہم تو اسلام کی اتنی خدمت کرتے ہیں اور مالِ غنیمت سے زیادہ حصہ ان مکہ والوں کو دے دیا گیا جو ابھی مسلمان ہوئے ہیں ممکن ہے کہ یہ بھی خیال کیا ہو کہ یہ اس لیے ہوا ہو کہ رسولؐ بھی تو مکے کے ہیں۔ بہرحال ان نوجوانوں میں ایک Whispering Campaign چلی کہ گویا ہم کو ہمارے حق سے محروم رکھا گیا۔ حضورؐ کو اس کی بھنک پہنچی کہ مدینہ کے کچھ نوجوان اس قسم کی چہ می گوئیاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ نے انصار میں جو بزرگ صحابی تھے ان کو جمع کیا اور فرمایا۔ اے انصارِ مدینہ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پہلے تم لوگ اندھیرے میں تھے اور میری وجہ سے اب روشنی میں آئے اور زندگی کی حقیقت کو سمجھے۔ انصار جو گردن جھکائے بیٹھے ہوئے تھے

بولے کہ بے شک اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہم پر بہت احسان ہے پھر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم لوگ آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے اور جب سے میں مدینہ آیا ہوں تم لوگ بھائی بھائی بن گئے ہو۔ انصار نے جواب دیا۔ بے شک اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بہت احسان ہے۔ پھر حضورؐ نے دریافت کیا۔ اے انصارِ مدینہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم مدینہ میں ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور یہود تم پر حاوی تھے۔ انصارِ مدینہ نے جواب دیا بے شک اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہم پہ احسان ہے حضورؐ نے فرمایا نہیں اے انصارِ مدینہ تم یہ جواب دو کہ اے محمد کیا یہ حقیقت نہیں کہ تو بے گھر مارا مارا پھرتا تھا۔ اب ہم نے تجھے گھر دے دیا اور یہ کہو کہ اے انصارِ مدینہ تمہارا احسان ہے مجھ پر۔ یہ سنتے ہی انصار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھر حضورؐ نے کہا کہ اے انصاریہ کہو کہ جب تیرے رشتہ دار تجھے نہیں مانتے تھے اور تیری مخالفت کرتے تھے اس وقت ہم نے تیری اطاعت کی ہم نے مکہ جا کر تجھ سے عہد کیا اور تجھ کو یہاں لے آئے اور یہ کہو بے شک انصارِ مدینہ تمہارا مجھ پر بہت احسان ہے۔ انصار کا حال برا تھا۔ پھر رسولؐ اللہ نے کہا کہ تم نے مجھے گھر دیا۔ تم نے مجھے پناہ دی۔ تم نے اسلام کی تبلیغ میں میری مدد کی۔ تم نے اپنی جان و مال سے میرے لیے دریغ نہ کیا اور اپنے لوگوں کو میرے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھا تو اے انصارِ مدینہ کیا تم اس بات پر رضامند نہیں ہو کہ یہ لوگ (یعنی نومسلم کی بھیڑ، بکریاں، اونٹ، گھوڑے وغیرہ سب لے جائیں اور تم محمد کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ سننا تھا کہ انصارِ مدینہ شکر کے سجدے میں گر گئے کہ اس سے بڑی دولت اور رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کا رسولؐ اپنے آپ کو ہم میں شامل کرو نے اور دیت عقبیٰ میں اپنا مرنا

جیسا ساتھ کردے۔ تو یہ مقام تھا انصار مدینہ کا۔

لیکن عزیزو اب خلافت کے وقت انصار کہیں نظر نہیں آتے۔ جو سرداروں اور سربراہوں کے نام ہیں اور جو حکومت کر رہے ہیں یا جو حکومت سے منسلک ہیں۔ ان میں کہیں کوئی انصار نظر نہیں آتا اور اگر ہے تو شاذ و نادر ہی۔ جو گٹھ جوڑ بن رہی ہے، قریش مکہ ہیں اور ان میں اب بنی امیہ بھی شامل ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے دس صحابیوں کی فہرست بنائی جاتی ہے جو عشرۂ مبشرہ ہیں۔ جن کی زندگی ہی میں رسول اللہ نے جنت میں جانے کی بشارت دیدی ہے ان تمام کی تمام فہرست میں کسی انصار کا نام نہیں۔ دنیا کی حکومتیں بھی یہ سوچتی ہیں کہ اگر کوئی انجمن بنانا ہے تو اس میں ہر گروپ کا نمائندہ ہونا چاہیئے مگر اللہ تعالیٰ نے جنت میں بھیجتے وقت اس بات کا خیال نہ کیا کہ کم از کم دو تین انصار ہی کا نام آجائے۔ اس عشرۂ مبشرہ میں سب کے سب قریش جو مکہ کے رہنے والے ہیں اور انصار کا کہیں پتہ نہیں۔

جناب امیر حضرت علیؑ کی کیفیت یہ تھی کہ چونکہ دنیا کا قلب اس طرف رجوع ہوتا تھا لہذا بظاہر ان کی عزت کی جاتی تھی مگر ایسی باتیں بھی کی جاتی تھیں کہ جس سے لوگوں کی نگاہ میں اس گھر کی عزت کم ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت ایک رقابت Rivalry تھی لیکن جناب امیر نے کبھی مشورہ دینے سے گریز نہیں کیا۔ یہ مشورے کیئے گئے کہ اسلامی سال کا آغاز کب سے ہو۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ حضورؐ کے سن پیدائش سے ہو۔ کچھ لوگوں کا مشورہ تھا کہ جنگ بدر سے ہو۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ رسول اللہؐ کی ہجرت سے آغاز ہو یا جس وقت مسلمان افواج ایران میں برسرِ پیکار

تھیں تو حضرت عمرؓ خود جا رہے تھے۔ حضرت علیؑ نے مشورہ دیا کہ آپ نہ جائیں۔ ورنہ آپ کے جانے سے دشمن یہ سمجھے گا کہ عرب میں جتنی فوجیں تھیں وہ سب ایران میں ہیں اور وہ ان کو گھیرے میں لے کر پوری ہمت اور طاقت سے لڑے گا۔ آپ فوجیں یہاں سے بھیجتے رہیں تاکہ دشمن کو مسلمان فوجوں کا کوئی اندازہ نہ ہو سکے اور اس کی ہمت صرف اسی اندیشہ سے پست ہو جائے کہ نہ جانے کتنی فوج ہے کہ ریلے پر ریلے چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح جتنے پیچیدہ اور مشکل مقدمات ہوتے تھے وہ حضرت علیؑ کے پاس بھیج دیے جاتے تھے اور آپ فیصلے کرتے تھے۔

تو اب صورت یہ ہوئی کہ قریش کا قبیلہ سب سے بڑا ہو گیا۔ دوسرے ممالک فتح ہوئے اور مسلمانوں میں باہمی امتیاز پیدا ہونے لگا۔ حالانکہ اسلام میں مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں۔ حضرت سلمان جو ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کے لیے رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ سلمانؓ منا اہل البیت ہر رنگ و نسل و ملک کے لوگ سرکارِ دوعالم کی بزم میں بلاتفریق مقام بیٹھے ہیں۔ حضرت بلالؓ حبشی بھی ہیں۔ صہیبؓ جو روم کے رہنے والے ہیں۔ غرض جو بھی ہے وہ سب بزمِ رسالت میں موجود ہے۔ حضورؐ کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان تمام سے ہٹ کر ان سے بلند ہو کر ملت کی تعمیر کی جائے لیکن اب یہ سلسلہ شروع ہوا کہ عرب اونچے ہیں اور عجم پست۔ اگر مسلم معاشرے میں ان کا کوئی مقام ہو سکتا ہے تو اس وقت جب وہ کسی عرب قبیلے یا خاندان کے موالی بنیں یا اس سے جا کر اپنا کوئی تعلق پیدا کریں تو گویا عرب اور عجم میں تفریق کی بنیاد پڑ گئی۔ اب مالِ غنیمت جو آنا شروع ہوا تو دولت کی افراط ہوئی۔ عزیزو! یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں اتنی دولت تھی کہ

زکوٰۃ کا لینے والا کوئی نہ تھا۔ مگر یہ تو سوچو کہ وہ دولت آئی کہاں سے وہ کس نے پیدا کی تھی اور کیسی دولت تھی۔ اس دولت کی پہلے جو تقسیم ہوتی تھی وہ ان لوگوں پر مساوی طور پر تقسیم ہوتی تھی جو جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ اور وہ تقسیم کرنے کے بعد رسولؐ اللہ مسکراتے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ رزاق ہے میں تو قاسم ہوں لیکن اب درجات مقرر ہو گئے کہ فلاں کو اتنا زیادہ وظیفہ ملے گا اور فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا کم۔ یعنی قبائلی پنشن کی حیثیت ہو گئی اور گھر بیٹھے پنشن پہنچ جایا کرے گی۔ اس کا معاشرے پر جو کچھ اثر ہو سکتا تھا وہ ہوا۔

حضرت علیؑ یہ تمام باتیں دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کا کیا رنگ ہو رہا ہے۔ اور معاشرہ کس رخ پر جا رہا ہے اور ذرا اندازہ کیجئے کہ وہ علیؑ جنھوں نے اسلام کے قیام میں اپنے دن رات صرف کیے تھے اور معاشرے قائم کرنے کے لیے انتھک کوشش کی تھی جو اسلام کے لیے سر ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے وہ جس وقت یہ دیکھتے ہوں گے کہ معاشرہ کس طرح بدل رہا ہے اور اسلامی اقدار کیوں کر تبدیل ہو رہی ہیں تو ان کے دل پر کیا کیا صدمات نہ گزرتے ہوں گے لیکن ان کے غم و غصہ پر امامت کے فرائض کا احساس حاوی تھا۔

عزیزو امام کی توجہ دین کے اصول میں دو اصولوں پر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک توحید۔ دوسرے عدل۔ توحید کا تقاضا یہ ہے کہ ملت میں اتحاد قائم رہے اور عدل کا تقاضا یہ ہے کہ سماجی تعلقات استوار رہیں تاکہ ملت متحد رہے کیونکہ جہاں عدل نہیں وہاں فساد

ہے۔ جہاد کا مقصد قیامِ عدل کی کوشش ہے۔ جو کوشش اور جو جدوجہد قیامِ عدل کے لیے کی جائے اس کا نام جہاد ہے۔ جہاں یہ نہیں وہاں فساد ہے اگر کسی معاشرے میں فساد ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ اپنے مرکزِ ثقل Centre of gravity یعنی عدل سے ہٹا ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس میں توازن Equilibrium قائم نہیں ہوتا ہے فساد کے معنی اس توازن کا بگڑنا ہے اور عدل توازن کو قائم رکھتا ہے جس کا نام امن ہے۔ تو امام کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ امت کی وحدت کسی طرح قائم رہے اور اس وحدت کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے جیسے زمانے میں حضرت علیؑ خلافتِ ظاہری پر متمکن نہ تھے انھوں نے اسی وحدت امت کی خاطر اپنے تمام ذاتی حقوق کو قربان کر دیا۔ اور بے شک اس سے بڑی قربانی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آپ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میرے حلق کے اندر کچھ اٹکا ہوا ہے۔ وہ اس لیے نہیں کہ وہ تختِ خلافت پر نہ تھے۔ علیؑ تو ایک فقیر انسان تھے۔ وہ تخت پر ہوں یا فرشِ خاک پر علیؑ علیؑ ہی رہیں گے۔ ان کی زندگی میں اس سے کوئی فرق نہیں آتا۔ چنانچہ یہی ان کا فریضۂ امامت تھا یعنی قیامِ امن اور وحدتِ ملت جو ان کو خاموش رہنے پر مجبور کیے ہوئے تھا اور ان کے بیٹوں نے یعنی حسنؑ اور حسینؑ نے جو کچھ کیا وہ اسی فرضِ امامت کے احساس کے تحت کیا۔ امام حسنؑ نے بھی اسی وحدتِ امت کو قائم رکھنے کے لیے معاویہ سے صلح کر لی

تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
نقش پا زد بہ سر تاج و نگیں

اور حسینؑ نے وحدت ملی کی جو بنیاد عدل ہے اس پر اس قدر زور دیا اور ظلم کی مخالفت میں جو کوشش کی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ امام حسینؑ نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ جس سے ملت دو حصوں میں یا factions میں تبدیل ہو جاتی یا کوئی فوج مرتب کرتے۔ یہ کچھ نہیں کیا بلکہ اس بات کا خاص خیال رکھا کہ یہ ظلم کی مخالفت کہیں باہمی خانہ جنگی civil war کی صورت نہ اختیار کر لے اور وہی حالات نہ پیدا ہو جائیں جو امام حسنؑ کے زمانے میں ہو گئے تھے۔ اسی لیے اپنے ساتھ بہت تھوڑے سے آدمی لے کر گئے تھے اور دانستہ طور پر اس عزم کے ساتھ گئے تھے کہ ظلم کی مخالفت کرنا ہے۔ قیام عدل کی کوشش کرنا ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کرنا ہے اور اس کوشش میں دو بھائی بہن یعنی علیؑ کی بیٹی زینبؑ اور علیؑ کے بیٹے حسینؑ شریک ہیں۔ تاریخ سے یہی پتہ چلتا ہے کہ امام حسینؑ کے جو ارادے تھے ان کا اگر کوئی رازداں تھا تو وہ حضرت زینبؑ کی ذات تھی اور امام حسینؑ کی شہادت کے بعد انہی کی ذات تھی جس نے اپنے بھائی کے مشن کو دربار یزید میں اختتام تک پہنچایا۔

پانچویں مجلس

تمام حمد اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندوں کو بغیر ہدایت کے نہیں چھوڑا جس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے انبیا کو مبعوث کیا اور انبیا اور رسل کے مختلف مقامات اور مختلف شانیں قرار دیں کوئی صفی اللہ ہوا، کوئی روح اللہ ہوا، کوئی کلیم اللہ ہوا اور کوئی حبیب اللہ ہوا۔ اور ہمارا دین ہے کہ ہم ان میں کسی میں فرق نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہو رہی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جو مقام متعین کیے ہیں یا جو شانیں ان کی مقرر کی ہیں جو ان کی خصوصیات ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہمارے رسولؑ ہیں اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے لیکن ہمارا مقام فیصلہ کرنے کا نہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی کسی وادی میں کھڑا ہے اور اس کے گرد فلک بوس پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں اسے نظر نہیں آتیں۔ اب وہ آدمی اس موقف میں نہیں ہے کہ یہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا پہاڑ کس پہاڑ سے بلند ہے۔ یہ فیصلہ وہ کر سکتا ہے جو ان پہاڑوں سے بھی بلند ہو اور ان پہاڑوں کی بلندیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔

اور ہمارا درود ہو محمد مصطفیٰؐ پر جن کو اللہ تعالیٰ نے ختم الرسل بنا کر

بھیجا اور جن کی ذات میں وہ تمام خوبیاں جمع کر دیں جو اس نے مختلف رسولوں کو علیحدہ علیحدہ دی تھیں۔

اگر جناب آدمؑ صفی اللہ تھے تو محمد مصطفٰےؐ مرتضٰی تھے۔ اگر ابراہیم خلیل اللہ تھے تو محمد مصطفٰےؐ حبیب اللہ تھے۔ اگر موسٰی کلیم اللہ تھے تو محمد مصطفٰےؐ پر اللہ نے اپنا کلام نازل کیا قرآن نازل کیا۔ اگر عیسٰیؑ کو رفعت دی تو محمد مصطفٰےؐ کو معراج بخشی۔

اور ہمارا اسلام ہو وصئی محمد مصطفٰےؐ پر کہ جس کی شان میں محمد مصطفٰےؐ نے فرمایا کہ لوگو! اگر تم انبیاء کو ان کی مخصوص شانوں میں دیکھنا چاہتے ہو تو علی ابن ابی طالب کے چہرے کی طرف دیکھو۔ اور ہمارا اسلام ہو حسنین علیہما السلام پر جن کے ذریعے سے شہادت اور فضیلتِ شہادت جناب محمد مصطفٰےؐ کو ملی اور ہمارا اسلام ہو ان کی ذریت میں آئمہ طاہرینؑ پر یعنی ہدایت کے اس سلسلے پر جو قیامت تک قائم رہنے والا ہے۔

سلسلۂ کلام کو کل سے ملاتے ہوئے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہم اپنی تاریخ سے واقفیت حاصل کریں اور یہ سمجھیں کہ کہاں غلطی ہوئی ہے اور کس بات پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ کسی کو برا نہیں کہنا ہے۔ تاریخ کو سمجھنا ہے وہ تو اس دنیا نے اور اس دنیا کے ظالم اور جابر بادشاہوں نے نازیبا کلمات حضرت علیؑ کے لیے مخصوص کر دیئے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک بات یاد آتی ہے جس سے بہت تکلیف ہوتی ہے اور وہ خود حضرت علیؑ کا ارشاد ہے۔ زمانہ ایسا پھرا کہ حضرت نے فرمایا۔ لوگو دیکھو وہ زمانہ قریب آگیا ہے جب تم پر اس بات پر جبر کیا جائے گا کہ تم میرے لیے نازیبا الفاظ نکالو اور مجھ پر سب و شتم کرو۔ اور اس مظلومیت پر ہماری جانیں قربان ہوں۔ کہ آپ

مزید فرماتے ہیں کہ جو کچھ تم سے کیا جائے وہ کرنا ۔ نازیبا الفاظ استعمال کرنا تمہاری جانوں کی سلامتی ہو جائے گی ۔ اور میں اپنے اللہ سے اس کے اجر کی امید رکھوں گا ۔ اور جس وقت منبروں پر بیٹھ کر حضرت علیؑ پر ایسے الفاظ اور اتہامات عائد کیے جائیں تو یہ خدا کا بندہ اپنے اللہ سے یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میرے مالک گواہ رہنا کہ یہ تمام باتیں اس لیے ہو رہی ہیں کہ میں نے تیرے راستہ سے قدم نہیں ہٹایا ۔ تیری عبادت اور تیری محبت کی وجہ سے میرے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے اور میں تجھ ہی سے اجر کا امید وار ہوں ۔ تو حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ میرے لیے زبان سے نازیبا الفاظ نکال دینا لیکن دل میں مجھ سے علیحدگی (برأت) نہ کرنا ۔ خدا کی قسم جب سے علی میں شعور آیا ہے علی کا قدم صراط مستقیم سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹا ہے لہذا ہم کسی پر سب و شتم نہیں کرتے لیکن تاریخ کو سمجھنے کی ضرور کوشش کرتے ہیں ۔

تو جیسا میں نے کل عرض کیا تھا اس عہد میں کچھ بنیادی باتیں بدل گئیں یعنی اس عہد کے عرب قبائل میں ان کا معاشرتی توازن بگڑ گیا یعنی قریش سے کچھ لوگ حاکم بن گیے اور کچھ قبائل کو جو طاقت ور تھے اپنی طرف ملا لیا ۔ کچھ لوگ محکوم بن گیے یہ وہ لوگ تھے جن سے حکومت کی نگاہیں ہوئی تھیں عرب و عجم کا فرق شروع ہو گیا گویا عرب سامراجیت Arab Imperialism کی بنیاد پڑ گئی ۔ جہاد جو ایک فریضۂ عبادت تھا اب پیشہ Prof-ession بن گیا ۔ اللہ کے سپاہیوں اور تنخواہ دار سپاہیوں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے ۔ اب اللہ کے سپاہی تنخواہ دار سپاہی بن گیے اور لوگوں کے پاس دولت آنا شروع ہو گئی اور دولت کی فراوانی سے

جو اثر اخلاق پر پڑتا ہے اور خاص کر اس دولت سے جو بغیر محنت کے حاصل ہو۔ وہ اثر ظاہر ہونے لگا۔ اور ہر جابر حکومت اس قسم کے سیاسی وظیفوں کی نوعیت اور ان کے فوائد سے واقف ہوتی ہے اور جب یہ بات اور آگے بڑھی تو وہ قبیلہ جو اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا اب اس کی حکومت بھی قائم ہو گئی اور اس کے افراد گورنری اور دوسرے ذمہ دار عہدوں پر نظر آنے لگے۔ تاریخ سے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جناب ابوذر غفاری کے متعلق حضور اکرم کا ارشاد ہے کہ کوئی ایسا آدمی نہیں جو دوزخ کی آنچ کو محسوس نہ کرے اور اللہ کا کرم ہے کہ وہ جس کو چاہے بچالے۔ لیکن ابوذرؓ کی ذات ایسی ہے جو دوزخ کی آنچ کبھی محسوس نہ کرے گا۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں کچھ نہ کچھ شیطان کا وسوسہ اور کوئی نہ کوئی شک و شبہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ایمان کو تقویت دیتا ہے کہ وہ ان وسوسوں اور شک و شبہات پر غالب آتا ہے۔ اور اللہ دوزخ کی آنچ سے بچالیتا ہے۔ لیکن ابوذرؓ وہ بندہ ہے جس کے دل میں کوئی وسوسہ کوئی شبہ۔ دنیا یا منصب کا لالچ یا دنیا کی طرف میلان ہوا ہی نہیں۔ یہ وہ شخص تھا جو فقر میں اپنا نمونہ تھا۔ یہ وہ ذات گرامی تھی جس کے متعلق رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ زمین نے کبھی ایسے آدمی کو نہیں اٹھایا اور آسمان نے کبھی ایسے آدمی پر سایہ نہیں کیا جو ابوذرؓ سے زیادہ سچا اور صحیح ہو۔ اور مزید فرمایا کہ ابوذرؓ کی زندگی اور موت بھی عجیب ہے وہ زندہ بھی تنہا اور اس کی موت بھی تنہائی میں آئے گی۔ تو ابوذر وہ تھا جس کی اللہ کا رسولؐ عزت کرتا تھا۔ اور اب وہی ابوذر شام میں موجود ہے۔ جہاں نبی امیہ کی حکومت قائم ہو رہی ہے اور اسلامی

مملکت کے اندر ایک دوسری مملکت قائم ہو رہی ہے۔ State within state کسی مقام پر مسلمانوں کی معمولی فتح ہوئی اور دمشق میں مسلمانوں نے اس فتح کا جشن منانا شروع کیا۔ گویا عید کا جیسا سماں تھا لیکن ابوذر رسول اللہ کا بڈھا صحابی بازار میں بیٹھا ہوا تھا اور نہ معلوم کیا باتیں یاد آئیں کہ اس کا دل بھر آیا اور رونا شروع کر دیا لوگوں نے کہا کہ اے ابوذر یہ تو مسلمانوں کی فتح ہوئی ہے اور خوشی کا موقع ہے۔ تم یہ بیچ بازار میں بیٹھے رو رہے ہو اور بد شگونی کر رہے ہو۔ ابوذر نے جواب دیا۔ میں کیسے نہ روؤں۔ میں نے اس اسلام کے پودے کو لگتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے بھی اس میں کچھ خدمت کی ہے۔ میں نے اس کو پھلتے پھولتے دیکھا ہے۔ اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمام کی تمام باتیں بدل رہی ہیں۔ اسلام ایسا بدل رہا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا تو میرے دل کو تکلیف نہ ہو گی تو اور کس کے دل کو ہو گی۔ ابوذر کی اس بات کو شام کی حکومت نے ایک زلزلہ خیز بات سمجھی اور حکومت کے لیے خطرہ سمجھا۔ کیونکہ ایسے آدمی کو ۔ agitator درغلانے والا کہا جاتا ہے۔ ایک ظالم کو سب سے زیادہ بری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ظالم کہا جائے ننگے کو ننگا کہنا بری بات سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ بارگاہِ خلافت میں لکھا گیا کہ لوگ ابوذرؓ کے پاس جاتے ہیں۔ ان کی باتیں سنتے ہیں اور حکومت سے بدظن ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ شخص یہاں رہا تو ہماری حکومت میں خلل پڑے گا۔ بارگاہِ خلافت سے ابوذرؓ مدینہ طلب کیے گئے ابوذرؓ مدینہ اس شان سے آتے ہیں کہ اونٹ پر کجاوا نہیں ہے ننگی پیٹھ پر سوار

ہیں۔ ضعیفی میں دمشق سے مدینہ تک سفر تھا۔ دونوں رانوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک عزت ان کی رسولؐ کے زمانے میں تھی اور ایک عزت ان کی یہ ہے۔ اب دربار خلافت میں نومسلم یہودیوں سے ابوذرؓ سے بحث کرائی جاتی ہے۔ جس میں کعب ابن احاد سب سے آگے ہے۔

ابوذر کلام پاک کی آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم جو یہ دولت جمع کر رہے ہو۔ سونے اور چاندی کے ڈھیر لگا رہے ہو تو یہ اکتناز کر رہے ہو۔ تو یاد رکھو یہی سونے اور چاندی کے ڈھیر آگ میں تپائے جائیں گے اور ان سے تمہاری پیشانیاں، کمر اور پیٹھ داغی جائیں گی۔ ابوذر کلام پاک کی آیات دہرا رہے ہیں اور نومسلم یہودی دربار خلافت کا وکیل بنا ہوا اس بات پر زور دے رہا ہے کہ جس وقت اس دولت سے زکوٰۃ کا حصہ نکال دیا گیا تو وہ دولت پاک ہو گئی اور تمام دولت حلال ہو گئی۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کر دوں کہ ابوذرؓ اپنے متعلق کہا کرتے تھے کہ میری عادت تھی کہ میں بہت باتیں پوچھا کرتا تھا۔ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ میں اپنے حبیب رسولؐ خدا سے دریافت کرتا تھا اور وہ تمام باتوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ خاموشی اختیار کرتے تھے اور میں اس خاموشی ہی کو جواب سمجھتا تھا۔ اور آج ایک نومسلم یہودی اس ابوذرؓ کو بتا رہا ہے کہ اسلام کیا ہے۔ عزیزو! اس یہودی کے قصہ میں مجھے ایک دوسری بات یاد آتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دوسرے صحابی نے جو یہودی تھا اس نے اس قسم کی باتیں کیں وہ صباحی فرقہ تھا جس کا سرآور وہ عبداللہ ابن صباح تھا تو عزیزو! ان ہی باتوں پر غور کرو ایسا نہ کرو کہ تمام الزام کسی دوسرے پر ڈال دو

جیسے یہود میں قاعدہ تھا کہ اپنی پوری Community کے گناہ ایک بکرے پر رکھ کر اس کو ویرانے میں چھوڑ آتے تھے اور اسی سے scape goat کی اصطلاح نکلی ہے۔ تو یہ نہ کرو کہ اپنے گریبان میں منہ ڈالنے کے بجائے کسی اور کو پکڑلو اور اس پر الزام لگادو اور پھر یہ بھی تحقیق نہ کرو کہ عبداللہ بن صباح تھا بھی یا نہیں۔ ایک مشتبہ آدمی پر اتنا استدلال نہ کرو۔ حقیقت کو دیکھو کہ دربار خلافت کی وکالت ابن آواد یہودی کر رہا ہے اور ابوذرؓ جیسے بزرگ صحابیؓ رسولؐ سے بحث کر رہا ہے۔ اور پھر ابوذرؓ کو حکم ہوا کہ مدینہ چھوڑ دو کیونکہ تم مدینہ میں رہنے کے قابل نہیں ہو۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ابوذرؓ نے خود اپنی مرضی سے یہ پسند کیا کہ مدینہ سے چلے جائیں۔ میں اس میں بحث نہیں کرتا لیکن یہ تو ظاہر ہو گیا کہ معاشرہ اتنا بدل گیا کہ وہ ابوذرؓ جو مدینہ میں ایک معزز مقام رکھتے تھے۔ جو اللہ کے رسولؐ سے بے حد قریب تھے اور اللہ کا رسولؐ ان کی عزت کرتا تھا۔ اب مدینہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ خود ہی مدینہ چھوڑ رہے ہیں تب بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ اتنا بدل گیا ہے کہ اب ابوذرؓ یہاں نہیں رہ سکتے اور جس وقت ابوذرؓ کو ربذہ کے لیے مدینہ سے نکالا جاتا ہے تو کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان سے ہمدردی ہی کے طور پر مدینہ کی سرحد تک ان کی مشایعت کرتا۔ صرف تین آدمی تھے جو حکومت سے مرعوب نہ تھے اور وہ ابوذرؓ کو رخصت کرنے گیے وہ تھے علیؓ اور ان کے دونوں بیٹے حسنؑ اور حسینؑ۔ جناب علیؑ ابوذرؓ سے کہتے جا رہے تھے کہ ابوذرؓ صبر کرو۔ تم اتنے غمگین کیوں ہو۔ تمہارا دل کیوں بھر آرہا ہے۔ ایک سیدھی سی بات ہے۔ تم کو ان لوگوں سے اپنے دین کا اندیشہ تھا۔ تمہارے دین کو ان لوگوں سے کوئی آنچ نہیں آسکتی اور ان کو تم

ئے اپنی دنیا کے لیے اندیشہ تھا کہ تمہاری موجودگی سے ان کی دنیا ختم ہو جائے گی تم کو نہ ان کی ضرورت ہے نہ ان کی دنیا کی ضرورت ہے ہاں جو چیز تمہارے پاس ہے اس کی ان کو ضرورت ہے۔ یہ اس کے محتاج ہیں۔ اس طرح سے حضرت علیؑ ابوذرؓ کو مدینہ سے رخصت کر رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اس کو خواہ کتنا ہی چھپانے کی کوشش کی جائے چھپ نہیں سکتا خواہ اس واقعہ کو اس بنا پر جائز قرار دیا جائے کہ ابوذرؓ کا مزاج بہت تیز تھا۔ وہ بہت سختی سے بات کرتے تھے۔ وہ جو کچھ بھی ہو ابوذرؓ کے لیے رسولؐ اللہ کی سند ہے کہ ابوذرؓ سے زیادہ سچا آدمی نہ زمین نے اٹھایا نہ اس پر آسمان نے سایہ کیا۔ لہٰذا وہ سخت کہتے ہوں یا ترش کہتے ہوں لیکن کہتے سچ تھے۔ ابوذرؓ اکثر فرماتے تھے کہ میرے حبیب رسولؐ اللہ نے مجھ سے یہ بات کہی تھی۔

(اب یہ رسالت کے بھید ہیں کہ ابوذرؓ کو ایک وصیت ہوتی ہے اور حضرت علیؑ کو اس کے خلاف وصیت ہوتی ہے۔)

رسول اللہؐ حضرت علیؑ سے فرماتے ہیں کہ دنیا تم سے آنکھیں بدل لے گی۔ علیؑ پوچھتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ میں ایسی حالت میں کیا کروں اور جب دنیا کو پاؤں تب کیا کروں۔ آپ نے جواب دیا کہ اے علیؑ تم وہ کرنا جو موسیٰؑ کی غیر حاضری میں ہارونؑ نے کیا تھا یعنی وہ دیکھتے رہے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں اور خاموش رہے اس خیال سے کہ امت میں پھوٹ نہ پڑ جائے اور گروہ نہ بن جائیں۔ تو اے علیؑ تم وہ کرنا جو ہارون نے کیا تھا۔ جب موسیٰؑ چالیس راتوں کے لیے طور پر چلے گئے تھے اور ان کی امت نے سونے کے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تھی۔ تو علیؑ سے تو یہ وصیت تھی اور ابوذر سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم جب

بھی دیکھنا کہ کوئی غلط کام ہو رہا ہے تو اس کو ضرور ٹوکنا۔ ہرگز خاموش نہ رہنا۔ اب یہ رسالت کے راز ہیں۔ ایک سے اس کے مقام کے مطابق یہ بات کہی جا رہی ہے کہ تم خون کے گھونٹ پیتے رہنا۔ دیکھتے رہنا لیکن کچھ کہنا نہیں۔ اور دوسرے سے کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی سچائی کی زبان ہو۔ جس وقت دیکھو کہ کوئی غلط بات ہو رہی ہے تو ابوذر خبردار ٹوکنا ضرور۔ ابوذرؓ خود کہا کرتے تھے کہ میں کیا کروں۔ میرا حبیبؐ تو مجھے وصیت کر گیا ہے کہ جس وقت کوئی خلافِ اسلام بات دیکھوں ٹوک دوں اور میں ضرور ٹوکوں گا خواہ میری زبان ہی کیوں نہ کاٹ دی جائے۔ تو ابوذرؓ کا احتجاج ان حکومتوں کے خلاف تھا۔

حضرت علیؑ کے خطبات اور مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے نہج البلاغہ۔ اس میں ایک خطبہ ہے جو خطبہ شقشقیہ کے نام سے موسوم ہے جس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تو بڑی سخت زبان ہے اور ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ یہ علیؑ کا خطبہ ہے۔ عزیز زادہ حضرت علیؑ کے علاوہ اور کسی کا خطبہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس میں جو تشبیہ اور استعادہ استعمال ہوئے ہیں وہ کوئی دوسرا استعمال ہی نہیں کر سکتا اور ایک ایک جملے میں حکومتوں پر مکمل تنقید کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ مختصراً سنئے کہ پہلی خلافت کے متعلق فرماتے ہیں کہ میرا مقام تو دین کے اعتبار سے وہ ہے جو چکی کے اندر قطب آسیہ کا ہوتا ہے چکی کے بیچ کا کھونٹا جس کے چاروں طرف چکی کے پاٹ گھومتے ہیں یعنی جو نسبت چکی کے پاٹوں سے قطب آسیہ کو ہے وہی نسبت اسلام کو مجھ سے ہے اور پھر آپ نے پہلی خلافت کے متعلق فرمایا کہ اس نے وہ قبا زیب تن کر لی جو اس کے جسم سے بہت بڑی تھی۔ یعنی اس جگہ بیٹھا

جو اس کے لیے بہت بڑی تھی۔ دوسری خلافت کے متعلق آپ نے جو استعارہ
استعمال کیا ہے وہ یہ ہے "اور پھر خلافت کی سانڈنی کو اتنا دوڑایا گیا
کہ اگر وہ رکتی ہے تو سوار کی خیریت نہیں اور اگر اس کو اسی طرح بھگائے
لیے جاتے ہیں تو اس سانڈنی کے نتھنے زخمی ہوئے چلے جا رہے ہیں اور وہ
سانڈنی زخمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عزیزانِ گرامی یہ فتوحات کی پالیسی ہے۔
سب حکمران جانتے ہیں کہ اگر اندرون ملک کچھ گڑبڑ ہو تو بہترین پالیسی یہ ہے
کہ باہر کی کوئی لڑائی شروع کر دو۔ حملہ کرو۔ فتوحات حاصل کرو۔ وہاں سے
دولت حاصل کرو۔ تمام قوم کا فخر سے سینہ پھولے گا۔ اور اندرون ملک کی
تمام برائیاں نظر سے اوجھل ہو جائیں گی۔ مگر ایسی پالیسی میں ایک خرابی ہے۔
جب تک جنگ جاری رہتی ہے اس وقت تک اندرونی فتنے
دبے رہتے ہیں مگر جب جنگ رکتی ہے فتوحات کا سلسلہ رکتا ہے تو وہ اندرونی
خرابیاں Recoil ہونا شروع ہو جاتی ہیں پھر وہ Boomerang
کی طرح ملت پر واپس آ جاتی ہیں۔ ایسی پالیسی کو انگریزی
میں Riding of tiger کہا جاتا ہے۔ نہ اس پر سے اترتے بنتا
ہے نہ اس سے جان چھڑاتے بنتا ہے۔ اور تیسری خلافت کے متعلق آپ
نے فرمایا کہ اس خلافت کے اونٹ کو اب چراگاہ میں چھوڑ دیا گیا جو تمام
چراگاہ کھا گیا چر گیا اور اس سے اس کو بدہضمی ہو گئی۔ گویا اقربا نوازی
والی بات جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں سے برداشت نہ ہوا اور مدینہ میں
ایک زبردست واقعہ پیش آیا۔ تو حضرت علیؑ کی یہ تنقید تینوں خلافتوں کے
متعلق ایک ایک استعارہ میں اس کا ثبوت ہے۔ اتنا فصیح اور بلیغ
کلام اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس خطبے میں آپ فرماتے ہیں کہ اے لوگو اگر میرے اوپر یہ حجت تمام نہ ہو جاتی اور تمام لوگوں نے مل کر بغیر شرط میری اطاعت کی قسم نہ کھائی ہوتی اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہ ہوتا کہ اہلِ ذکر اور اہل علم ہر حال میں غریبوں کی مدد کریں اور ظلم کی مخالفت کریں تو اس خلافت اور حکومت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا اور تم کو معلوم ہے کہ اس خلافت کی حیثیت میری نگاہ میں بکری کی چھینک سے زیادہ نہیں۔ ایک دوسرے موقعہ پر آپ نے اس حکومت کے متعلق فرمایا ہے اور وہ واقعہ یوں ہے کہ آپ بیٹھے ہوئے اپنی جوتیوں کی مرمت کر رہے تھے ضمناً یہ عرض کر دوں کہ جہاں حضرت علیؑ کا خطاب ابوتراب تھا۔ وہاں خادم النعل بھی تھا یعنی اگر زمین پر لیٹیں تو ابوتراب اور اگر اپنے بھائی رسولؐ اللہ کی جوتیوں کی مرمت کریں تو خادم النعل تو جب آپ اپنی جوتیوں کی مرمت کر رہے تھے تو ابنِ عباس آئے اور کہا کہ امیرالمومنین یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ جوتیاں تو اب مرمت کے قابل بھی نہیں رہیں۔ تو امیرالمومنین نے مزاح کے طور پر ابنِ عباس سے پوچھا کہ تمہارے خیال میں ان جوتیوں کی کیا قیمت ہو گی۔ ابنِ عباس نے کہا کہ اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے یہ پھینکنے کے قابل ہیں۔ البتہ چونکہ یہ آپ کی ہیں اس لیے کم از کم میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا یہ جو خلافت اور حکومت ہے اس کی قیمت اس جوتی کے تسمہ کے برابر بھی نہیں ہے عزیزانِ گرامی اگر یہ حکومت حکومتِ الٰہی ہوتی۔ خلافت الٰہی ہوتی۔ ناموسِ کبریٰ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ہوتی تو حضرت علیؑ اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی رسول رسالت کے لیے کوئی امام امامت کے لیے یہ الفاظ استعمال نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ رسالت اور

امامت ناموسِ کبریٰ ہیں اور اللہ کی بخشی ہوئی سعادتیں ہیں اور اسی لیے میں بتانا چاہتا ہوں کہ خلافت اور چیز ہے اور خلافتِ الٰہیہ اور ہے۔ اگر یہ خلافت خلافتِ الٰہیہ ہوتی تو جناب امام حسنؑ اس کو کسی کے سپرد نہیں کر سکتے تھے کسی نبی نے نبوت اور کسی امام نے اپنی امامت کسی کے سپرد نہیں کی۔ کیونکہ وہ اللہ کا عطیہ ہوتی ہے اور اس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ مامون رشید امام علیؑ رضا پر بہت مہربانی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے امام سے کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں یہ خلافت آپ کے حوالے کر دوں۔ امامؑ نے فرمایا کہ مامون اگر یہ خلافت تجھ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی ہے تو تجھ کو یہ حق نہیں کہ دوسرے کو دیدے۔ اور اگر یہ خلافت تیری نہیں ہے تو پھر تجھے دوسرے کو دینے کا کیا حق ہے اس میں سب سے بڑا نکتہ جو ہے وہ یہ کہ امام علیؑ الرضا کو جو امامت یا خلافت ہے وہ منجانب اللہ ہے۔ مامون کیا ان کو خلافت دیتا نہ اس کا یہ مقام تھا کہ وہ ان کو خلافت دے۔ تو یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ حکومت اور چیز ہے اور خلافت اور امامت کا رتبہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔

تو حضرت علیؑ کا خلافت کے متعلق یہ موقف تھا۔ یہ بہت عبرت ناک قصہ ہے اور حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے مختلف تنقیحات کو issues کو الجھا دیا گیا ہے اور confussion پیدا کر دیا گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ حضرت علیؑ کو خلافتِ ظاہری ملنے پر جو شام کے حاکم تھے ان کو فکر یہ ہوئی کہ اب یہ حکومت اپنے پاس رہنا مشکل ہے پہلے تو کوشش اس بات کی ہوئی کہ یہ ضمانت مل جائے کہ شام کی حکومت جو بڑے بھائی کو ملی تھی وہ قائم رہے۔ حضرت علیؑ کو اس بات کی ضد کیوں تھی کہ بنی امیہ کی حکومت

شام پر نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شام میں جس اسلام کی تبلیغ ہو رہی تھی اس کی صورت وہ تھی جو ان لوگوں کے ذریعے سے پہنچا تھا۔ جو فتح مکہ کے بعد وہاں گئے تھے جن کی تربیت grounding اسلام کے طور طریقوں میں یا صحیح طور سے نہ ہو سکی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناواقف تھے اور جن کی عمر کا زیادہ حصہ اسلام کی مخالفت میں گزرا تھا۔ یہ لوگ حضور اکرم کی حیاتِ طیبہ کے آخری ڈیڑھ سال میں مسلمان ہوئے تھے اور وہ بھی اس وقت جب ان کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ شام میں ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں دیندار لوگوں کو بھیج کر اور ان کی ذمہ داری قائم کر کے صحیح اسلام کی تبلیغ کی جائے۔ کیونکہ وہ گمراہی کے راستہ پر پڑ گئے تھے۔ لہذا حضرت علیؑ بنی امیہ کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب دوسری طرف قریش کے بڑے بڑے لوگ یعنی Elite ہیں۔ ان کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ عبدالرحمن بن عوف نے جب انتقال فرمایا تو کتنی دولت ان کے پاس تھی۔ اور زبیر جب دنیا سے اٹھے تو ان کا ذاتی خزانہ کتنا تھا اور طلحہ جب اٹھے تو کتنی دولت چھوڑی۔ یہ اعداد و شمار تعجب خیز اور افسوسناک ہیں۔ زبیر حضرت علیؑ کے قریبی دوست تھے اور ہمیشہ ان کی موافقت میں تھے مگر یہ دنیا کا لالچ بڑی بہکانے والی چیز ہے اور بڑا ایمان خراب کرنے والا جذبہ ہے۔ اب حضرت علیؑ کے خلیفہ ہونے کے بعد طلحہ اور زبیر دونوں اس امید میں رہے کہ حکومت میں ان کی بھی شرکت ہو جائے۔ بصرہ کی حکومت طلحہ کو مل جائے اور کوفہ کی زبیر کو مل جائے حکومت ان لوگوں کی ہو اور حضرت علیؑ مدینہ میں بیٹھے رہیں اور نام کے لیے خلافت ان کی ہو۔ اس امید میں ان لوگوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی۔ حاکمِ شام نے زبیر کو خط لکھا تو اس میں امیر المومنین

زبیر کے لقب سے مخاطب کیا کہ امیر المومنین زبیر کو معلوم ہو کہ شام میں میں نے ان کے نام پر بیعت لے لی ہے اور چونکہ آپ اور طلحہ دونوں رسول اللہؐ کے بزرگ صحابی ہیں۔ لہذا طلحہ بصرہ میں اور آپ کوفہ میں قیام کریں اور یہ خلافت آپ ہی کو سزاوار ہے اور پھر یہ بھی بتایا کہ اس وقت علیؑ کی فوج میں بہت سے قاتلان عثمان شامل ہیں لہذا کیوں نہ علیؑ پر قتل عثمان کی تہمت لگائی جائے۔ رسول اللہؐ کے ان صحابیوں کو جن کو دولت کے لالچ نے اندھا کر دیا تھا۔ ان کے دماغوں میں یہ بات سما گئی اور حاکم شام کی اس تجویز سے خوش ہوئے اچھا ہے یہ آپس میں لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں۔ ان دونوں میں سے جس کی بھی فتح ہو گی ہمارے لیے اچھا ہے۔ دونوں رقیب ہمارے سامنے کمزور ہو جائیں گے چنانچہ جنگ جمل واقع ہوئی اور حضرت علیؑ یہ کہتے رہے کہ دیکھو تم دھوکہ کھا گئے ہو۔ آنکھیں کھولو۔ زبیر کو تو آپ نے بلا کر سمجھایا اور انھوں نے کہا کہ بیشک آپ ٹھیک کہتے ہیں اور وہ لشکر سے الگ ہو کر جانے لگے اور قتل کر دیئے گئے۔

تصویر کا ایک رخ آپ نے دیکھا۔ یعنی عبد الرحمٰن ابن عوف۔ طلحہ اور زبیر کی دولت۔ اب دوسرا رخ ملاحظہ ہو۔ حضرت علیؑ کے حقیقی بھائی آپ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھیا یہ آپ کے بھتیجے ہیں۔ ہمارا کام نہیں چلتا اور خرچ پورا نہیں ہوتا۔ بیت المال سے کچھ زیادہ دلوا دیں۔ حضرت علیؑ سنتے رہے۔ آگ جل رہی تھی اور لوہے کی ایک سلاخ پڑی تھی۔ آپ نے اس سلاخ کو آگ میں رکھ دیا اور گرم کرتے رہے۔ حضرت عقیلؓ کو یقین تھا کہ علیؑ غور سے سن رہے ہیں اور ضرور کوئی صورت اضافہ کی نکلے گی۔ مگر تھوڑی دیر بعد حضرت علیؑ نے اس گرم سلاخ کو عقیل کے قریب کیا تو عقیل گھبرا گئے

اور کہا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ سلاخ گرم ہے بدن جل جائے گا۔ تب حضرت علیؑ نے فرمایا کہ عقیل یہ ایک چھوٹی سی آگ جو ایک بندہ خدا نے لگائی ہے تو اس کی حرارت تم اتنی دور سے برداشت نہیں کر پاتے اور میرے لیے تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس آگ کی طرف چلا جاؤں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے غضب سے بھڑکائی ہے

تو ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو دولت کے عادی ہو چکے تھے اس طرف نہیں آسکتے تھے۔ جہاد میں ایک طرف تو بتایا جا رہا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے اور حق کی تائید کرنا کس طرح تم پر فرض ہے۔ اور دوسری طرف بڑی بڑی رشوتیں دی جا رہی ہیں Elite اور حکمرانوں کی Class بنائی جا رہی ہے جن کے پاس ایک باقاعدہ سپاہ Standing Army ہے جس کا باقاعدہ Regimentation ہو رہا ہے اور ایک خاص قسم کا اسلام بنایا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ بنی امیہ اور امیر شام رسول خدا سے کتنے نزدیک تھے اور یہ بتانے والے اب بھی موجود ہیں اور وہ Regimentation اور وہ پروپیگنڈا اب بھی جاری و ساری ہے۔ عزیزو دیکھو جس وقت کوئی معاشرہ کا چلن بگڑ جاتا ہے تو وہ ایک غلط لائن پر چل پڑتا ہے۔ محمد مصطفیٰ نے معاشرہ کو جس لائن پر لگایا تھا وہ لائن فتوحات میں تبدیل ہو گئی۔ حکومت دولت بڑے امتحان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فراخی بھی اس کا امتحان ہے اور تنگی بھی اس کا امتحان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تنگی اتنا سخت امتحان نہیں ہے جتنا سخت امتحان فراخی ہے تنگی کے زمانے میں تو اللہ تعالیٰ کی یاد آجایا کرتی ہے لیکن فراخی کے زمانے میں اللہ یاد نہیں آتا۔ تو حکومت اور دولت اللہ تعالیٰ کے بڑے امتحانات ہیں۔ اگر انسان اس

جگہ پر ہو جہاں اس پر اعتراض کرنے والا کوئی نہ ہو اور اس کے پاس دولت
بھی ہو اور وہ خدا کو یاد رکھے تو وہ مردِ خدا ہے اور وہ بہادر آدمی ہے۔ ورنہ
انسان تو اللہ تعالیٰ کو بہت آسانی سے بھولا کرتا ہے جس وقت حکومت
یا دولت کا نشہ چڑھتا ہے اور طرح طرح سے اس کا جواز پیدا کرتا ہے اور
اس طرح سامراج Imperialism اور Empire کا مزاج
پیدا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر بڑے سے بڑا آدمی یہی کر سکتا ہے کہ وہ حق و باطل
کے فرق کو نمایاں کر دے۔ یہ بتا دے کہ حق کس کو کہتے ہیں اور باطل کس کو کہتے ہیں
تا کہ حق چھپنے نہ پائے۔ لیکن ملت جس راستے پر چلنے لگتی ہے وہ راستہ
نہیں بدلا کرتا تاوقتیکہ cycle پوری نہ ہو جائے اور تمام برائیاں کھل کر
سامنے نہ آ جائیں۔ اس وقت راستہ بدلا کرتا ہے اور اسی وجہ سے جب اسے
امام جب ظہور فرمائیں گے اس وقت دنیا جس راستے پر چل رہی ہے اس
کے نتائج معلوم ہو جائیں گے۔ دنیا میں ایک Disgust پیدا ہو جائے
گا۔ اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ راستہ جس پر آبِ حیات کا راستہ سمجھ کر
چل رہے تھے وہ سوا سراب کے اور کچھ نہ تھا۔ جس وقت یہ حقیقت معلوم
ہو جائے گی کہ ہم نے اپنے چاروں طرف جو تعیش کے سامان جمع کیے ہیں
ہماری روح مردہ ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہم پاگل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔
اور ہماری روح بیمار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس وقت یہ سائیکل پوری ہو جائے
گی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ دنیا پوری کی پوری برائیوں سے بھر جائے گی یہ صحیح
ہے۔ نئی زندگی پیدا ہی اس وقت ہوتی ہے جب پرانی زندگی اپنی سائیکل مکمل
کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کوئی انسان ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جو اپنے آپ
کو Sacrify کر جائے اور نتیجہ کو جانتے ہوئے دنیا کو بتا دے کہ حق کیا

ہے اور باطل کیا ہے۔ چنانچہ حضرت علی فرماتے تھے کہ معاویہ اپنے آپ
کو بہت چالاک۔ مکار اور ہوشیار سمجھتا ہے۔ میں یہ چالیں اچھی طرح جانتا
ہوں۔ یہ میرے لیے بہت آسان ہیں لیکن میرے پاؤں میں تو آئینِ خدا
کی زنجیریں پڑی ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے قانون سے ذرہ برابر بھی نہیں
ہٹ سکتا۔ معاویہ اپنے کو بہت چالاک سمجھتا تھا۔ لیکن حضرت علیؑ کے
لیے اس کو انہیں چالوں سے زیر کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔

آج یہ کہا جاتا ہے کہ علیؑ تھے بہت بہادر اس لیے کہ ان کی
بہادری پر کینے پردہ ڈالا جائے لیکن وہ جو کمانڈ کرنے کی اور ایڈمنسٹریشن
کی صلاحیت ہوتی ہے وہ ان میں کم تھی۔ عزیزو۔ یہ ہمیشہ یاد رکھو
کہ اپنا گز بنا کر دوسروں کو نہ ناپو۔ اپنے معیار قائم کر کے دوسروں کو مت
جانچو۔ پہلے یہ سوچ لو کہ جس آدمی کے متعلق بات کر رہے ہو اس کا معیار
کیا تھا۔ یہ دیکھو کہ وہ کس قد و قامت کا تھا اور وہ چاہتا کیا تھا۔ پھر یہ دیکھو
کہ وہ چاہتا کیا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہوا یا نہیں۔ اور اس وقت
تمہاری سمجھ میں اس فقرے کے معنی آجائیں گے جو حضرت علیؑ کی زبان
سے اس وقت نکلا جب ابن ملجم ملعون نے نماز کی حالت میں آپ
کے سر پر تلوار کی ضرب لگائی اور آپ نے برجستہ فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم
میں کامیاب ہو گیا۔ اور یہ کامیابی تمہاری سمجھ میں اس وقت آئے گی
جب تم یہ اندازہ کرو گے کہ یہ شخص جو اس وقت خلافت ظاہری پر ہے
چاہتا کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کا معیار کیا ہے۔ یہ کامیابی کس
کو کہتا ہے اور ناکامی کس کو کہتا ہے۔ اس وقت علی کی کامیابی بھی سمجھ میں
آجائے گی۔ اور اس وقت کربلا میں حسین کی فتح بھی سمجھ میں آجائے گی اس

فتح کے متعلق ایک واقعہ بیان کر دوں۔ کربلا کے سانحہ کے بعد امام زین العابدینؑ مدینہ پہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے چاروں طرف مجمع کر لیا اور کربلا کے واقعات پوچھ رہے تھے اور آپ تفصیلات بتا رہے تھے۔ جب آپ سب کچھ کہہ چکے تو ایک شخص نے عجیب سوال کیا کہ مولا ہم نے سب باتیں تو سن لیں۔ اب یہ فرمایئے کہ فتح کس کی ہوئی گویا ساری باتیں سننے کے بعد اور یہ دیکھنے کے بعد کہ آلِ رسول کیسے برباد ہوئی اور یہ گھر کیسا ویران ہو گیا۔ اس کو یہ احساس ہے کہ جو آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ طبیعت ماننے کو تیار نہیں کہ گویہ مٹھی بھر فوج تھی اس کو شکست ہوئی۔ امام نے جواب دیا کہ تھوڑا سا صبر کر۔ ابھی تھوڑی دیر میں نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ مسجد سے موذن کی آواز بلند ہوا چاہتی ہے۔ جب اللہ اکبر کی آواز سننا تو اپنے دل میں سوال کرنا اور تجھ کو خود جواب مل جائے گا کہ فتح کس کی ہوئی۔ کامیابی اور فتح ایسے ہی موقعوں پر سمجھ میں آتی ہے۔

امام حسنؑ نے جب یہ دیکھا کہ امت میں تفرقے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ایسے میں جہاد ناممکن ہے۔ اب مسلمان مالی فائدہ کے غلام بنتے چلے جا رہے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ گویا ملتِ اسلامی ختم سی ہو رہی ہے تو ایسی حالت میں امام نے یہ بات کی کہ اگر ملتِ اسلامیہ اس سے قائم رہتی ہے کہ میں حکومت سے علیحدہ ہو جاؤں تو ہوا جاتا ہوں اور معاویہ سے چند شرائط پر صلح ہو گئی۔ اب بات یہ صاف کرنا ہے کہ امام حسنؑ نے معاویہ کی بیعت کی یا نہیں۔ اس کے لیے میں کربلا کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں عمر ابن سعد امام حسینؑ سے گفتگو کر رہا ہے۔ وہ تذبذب کے عالم میں ہے یعنی double minded ہے کیونکہ اس کے باپ سعد بن وقاص

رسول اللہ کے صحابی رہ چکے ہیں اس کے سامنے ایک طرف دنیا ہے دوسری طرف دین ہے۔ اسے اس امر کا احساس ہے جیسا کہ اس کے اشعار سے ظاہر ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ بڑا متامل ہوں Suspense میں ہوں اور حیران ہوں کہ کیا کروں کیونکہ حسین کو شہید کرنا بڑا سخت معاملہ ہے لیکن کیا میں ملک رے کی حکومت کو چھوڑ دوں۔ پھر کہتا ہے کہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑے گناہ کو بخش دے گا اور توبہ بھی تو ایک ذریعہ ہے۔ میں توبہ کر لوں گا۔ پھر اس کا دل کہتا ہے کہ یہ وہ گناہ نہیں جو توبہ سے دھل جائے تو اگر گناہ کی معافی نہ بھی ہو تو دنیا میں تو یہ فائدہ ہے کہ نقد ہاتھ آئے گا۔ تو کوئی عقل مند آدمی نقد فائدہ کو ادھار فائدے کے لیے نہیں چھوڑتا۔ اس کا دماغ اس طرح کام کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کو رے کی حکومت بھی مل جائے اور امام حسینؑ کا خون بھی اس کے ہاتھ سے نہ ہو۔ اور وہ اسی عنوان سے امام حسینؑ سے گفتگو کر رہا ہے امام حسینؑ فرما رہے ہیں کہ میں مدینہ واپس جانے کو تیار ہوں مجھے تم لوگوں نے بلایا تھا۔ اب اگر تم لوگ نہیں چاہتے ہو تو میں نے اپنی حجت تمام کر دی۔ لیکن میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔ عمر سعد نے گفتگو قلمبند کر کے کوفہ کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد کو بھیجی اور لکھا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اوپر سے یہ بات ٹال دی اور حسین اس بات پر تیار ہیں کہ وہ مدینہ واپس جائیں۔ یہ بڑی اچھی بات ہوئی کہ سمجھوتا ہو گیا اور ہم ایک اہم آزمائش میں نہیں پڑے۔ عبید اللہ ابن زیاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے تجھے حسین سے بیعت لینے کو بھیجا تھا سمجھوتہ کرنے کو نہیں۔ اب آپ سمجھ لیں کہ بیعت کی بات اور ہوتی ہے اور صلح کی بات اور ہوتی ہے۔ اس کا جواب عمر سعد یہ دیتا

ہے کہ امیر کوفہ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حسین بیعت کسی حال میں نہیں کریں گے اس لیے کہ ان کے سینہ میں ان کے باپ کا دل ہے۔ اس سے تمام باتیں صاف ہوجاتی ہیں۔ ان چند جملوں سے جو تاریخ میں محفوظ ہیں صلح حسنؑ کی حقیقت اور حضرت علیؑ کا خلفا کے زمانے میں جو رویہ تھا وہ ظاہر ہوجاتا ہے۔

امام حسنؑ نے جب صلح کی تو معاویہ نے سوچا کہ ذرا میری بات اور بڑھے تو اس نے ایک خط لکھا کہ حسنؑ ابن علیؑ یہ خوارج آپ کے والد کے بھی بہت خلاف تھے اور اسلام میں ایک فتنہ اٹھا رکھا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ آپ اس فتنہ کو دبائیں اور خارجیوں کی سرکوبی کریں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جنگِ نہروان میں حضرت علیؑ خارجیوں کو سزا دے چکے تھے۔ خارجی حضرت علیؑ کو بھی برا کہتے ہیں۔ لہٰذا امیر معاویہ کی یہ چال تھی کہ اس کے سر خا بکے پر لگ جائیں گے اگر امام حسنؑ اس کی لڑائیاں لڑیں گے۔ امام حسنؑ نے اس کے جواب میں لکھا کہ معاویہ تم نے جو یہ فساد کی بات کی ہے تو بے شک خارجی فساد پیدا کر رہے ہیں لیکن اگر میں مناسب سمجھتا کہ فساد کا علاج تلوار کے ذریعہ کیا جائے تو تم اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ تمہارے خلاف تلوار اٹھائی جائے یہ خطوط اکثر تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

معاویہ سے صلح کے بعد امام حسنؑ نے فرمایا کہ اے لوگو تم نہیں جانتے کہ میں نے تمہارے لیے کیا کیا ہے۔ میں نے وہ کیا ہے کہ جس سے بہتر چیز پر سورج طلوع نہیں ہوا ہے اور نہ اس سے بہتر چیز پہ سورج غروب ہوا ہے میں نے وہ کیا ہے جو خضر نے موسیٰ کے سامنے کیا تھا (اس نکتہ کی توجیہ آئندہ پیش کروں گا۔)

آدمی ایک مرتبہ مرتا ہے لیکن امام حسنؑ کی صلح والی زندگی روز کی پھانسی کے مترادف تھی یعنی روزانہ پانچ وقت مسجد میں جانا اور اپنے پدر بزرگوار پر لعن و تشنیع اور نازیبا الفاظ سننا۔ مگر امام کی شان یہ ہے کہ جو اللہ کی مرضی ہو اس کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ امام صبر کرتے تھے لیکن آپ کے بہت سے ساتھی اور چاہنے والے اس صلح سے خوش نہیں تھے بلکہ کچھ لوگ تو ایسے تھے جنھوں نے یہ سمجھ کر کہ امام حسینؑ اس فیصلہ سے خوش نہ ہوں گے۔ ان کی طرف رجوع کیا لیکن انھوں نے جواب دیا کہ حسن ہمارے امام ہیں، تم یہ کبھی خیال نہ کرنا کہ ان کے فیصلہ سے مجھے ذرہ برابر بھی اختلاف ہے۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ میرے بھائی جو فیصلہ کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہا کہ میرے امام جو فیصلہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ امام کے لیے تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ ملت کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہے۔ ایک چرچہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے مزاج میں بڑا فرق تھا۔ امام حسنؑ صلح پسند تھے اور امام حسینؑ کسی بات کو برداشت نہیں کرتے تھے اور یہ دیکھ لو کہ امام حسنؑ نے کیا کیا اور امام حسینؑ نے کیا کیا۔ عزیزو وہ امام ہی نہیں ہوتا جو اپنی خواہشات اور نفس کی پیروی کرتا ہے۔ امام وہ ہوتا ہے جس کی مرضی تابع الٰہی ہوتی ہے اور اللہ کی مرضی سے نرم اور گرم ہوتا ہے۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ کسی بات سے خوش ہو کر اس کی شہرت کریں یا کسی بات سے ناراض ہو کر اس کو برا سمجھیں۔ وہ علی ابن ابی طالب جس کا شجاعان عرب لوہا مانتے تھے وہ علیؑ اپنے گلے میں رسّی بندھوا سکتا ہے اور خاموش رہتا ہے۔ اس موقعہ پر ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب علیؑ کی گردن میں رسّی

باندھ کرلے جانے لگے اس وقت سلمان اور ابوذر دونوں موجود تھے
ابوذر نے تلوار کو میان سے نکال لیا مگر سلمان امام کی جانب دیکھتے
رہے کہ اگر اشارہ ہو تو جہاد کیا جائے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ سلمان
ایمان کے دس درجہ پر اور ابوذر نو درجہ پر فائز ہیں تو امام وہ ہے کہ جیسا
اللہ کا امر ہوتا ہے ویسا کرتا ہے۔ صلح کا موقع ہے تو صلح اور جنگ کا موقع ہو تو
جنگ۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ایک کی طبیعت نرم تھی صلح جو تھی اور ایک کی
طبیعت گرم تھی۔ یہ لوگ اس لیے کہتے ہیں کہ ہم سب اپنے مزاج کے مطابق
زندگی بسر کرتے ہیں امام میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ امام مرضات وامرالٰہی
کے تابع ہوتا ہے امام حسنؑ نے امامت کی یہ شان دکھائی کہ ایسی بات کی
جس کا اللہ تعالیٰ کا امر تھا اور جو امت کی بھلائی کے لیے تھے اور اس کی
پروا نہ کی کہ دشمن تو دشمن دوست بھی ملامت کریں گے۔ وادیٔ ملامت سے
گزرنا بھی خضرِ امامت کا کام ہوتا ہے۔ اور یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ میدانِ
جنگ میں ایک بار جان دیدینا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ زندگی کا ہر لمحہ سوہانِ
روح ہو کر سامنے رہے اور وہ دیکھے کہ اس کے دوست بھی اس کی بات
کو نہیں سمجھتے حالانکہ وہ برابر کہے جارہا ہے کہ تم بھو کہ میں نے کیا کیا میں نے
وہ کیا جو خضرؑ نے موسیٰؑ کی موجودگی میں کیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ سر الشہادتین
ایک امام حسنؑ کی شہادت اور ایک امام حسینؑ کی۔ اس کتاب میں رسول اکرمؐ
کی تمام فضیلتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ایک فضیلت رسول اللہؐ
کے لیے باقی رہ گئی تھی یعنی شہادت۔ اللہ تعالیٰ نے جناب یحییٰؑ اور جناب ذکریاؑ
کو شہادت کے درجہ پر فائز کیا لیکن محمد مصطفےٰؐ کو یہ نہیں دیا۔ اس کی

وجہ یہ تھی کہ اسلام کی شان و شوکت میں اور اس کی ترقی میں اس سے رکاوٹ پڑتی لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ محمد مصطفیٰ اس بڑی فضیلت سے محروم رہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حسنؓ اور حسینؓ کے ذریعے جن کو رسول اکرم اپنا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ اپنے بیٹے سمجھتے تھے۔ محمد مصطفیٰ کو یہ فضیلت عطا فرمائی۔ شہادت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک شہادت خفی ہوتی ہے اور دوسری جلی۔ خفی شہادت وہ ہے جس کا علم محض اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے اور کسی کو نہیں ہوتا۔ بندہ اپنے اجر کا صرف اللہ تعالیٰ سے امیدوار ہوتا ہے شہادتِ جلی وہ ہوتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ظاہر ہو اور لوگ اس سے واقف ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں شہادتیں اپنے حبیبؐ کو عطا فرمائیں اور وہ اس طرح کہ ایک پارہ جگر کو شہادتِ خفی دی اور دوسرے کو شہادتِ جلی اور پھر لکھتے ہیں کہ جب امام حسنؓ کو یہ شہادت نصیب ہوئی اور امام حسینؓ نے پوچھا کہ بھیا یہ کیا ماجرا ہوا۔ مجھے آپ بتائیں تو سہی کہ ماجرا کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ حسین میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دینا۔ تم اس معاملہ میں کچھ نہ کرنا۔ میں نے اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑا ہے۔ ہماری جانیں قربان ہوں اس صبر و تحمل پر۔ یہ شہادتِ خفی کی خصوصیت ہے۔

اور شہادتِ جلی کی خصوصیت یہ ہے کہ بستی سے دور جنگل بیابان میں ایک واقعہ ہو لوگ اس کو چھپانے کی کوشش کریں اور جتنا اس کو دبائیں اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا جائے۔

یہ بھی سن لیجئے کہ اولادِ حسنؓ پر کیا گزری۔ بغداد کا کوتوال باہر بیٹھا ہوا ہے (ہارون رشید کے زمانہ کا واقعہ ہے) اس کا دوست آتا ہے گرمی

کا زمانہ ہے۔ دونوں مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ کوتوال اپنے دوست سے پوچھتا ہے کہ شربت پیو گے۔ دوست نے جواب دیا کہ اس کا روزہ ہے۔ کوتوال اپنے ملازم سے کہتا ہے کہ میرے لیے فلاں شربت لے آؤ۔ اس کا دوست اس کو ملامت کرتا ہے کہ رمضان کا مہینہ ہے ایک تو تو روزہ نہیں رکھتا پھر اتنے کھلے عام کھاتا پیتا ہے۔ کوتوال نے کہا کہ اب تھوڑی سی زندگی رہ گئی ہے اس میں روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس کا دوست پریشان ہوا اور خیال کیا کہ شاید اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے اور اس سے بالکل مایوس ہو گیا ہے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا ہے گناہوں سے توبہ کرو وہ بڑا غفار اور بخشنے والا ہے۔ کوتوال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور بولا کہ میرا گناہ قابلِ معافی نہیں۔ پھر اس نے ایک واقعہ سنایا۔ ایک رات میں بیٹھا ہوا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید نے مجھ کو بلا بھیجا میں پہنچا تو دیکھا کہ خلیفہ تلوار لیے ٹہل رہا تھا۔ اس نے پوچھا کہ تم مجھ کو کتنا عزیز رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ امیر المومنین یہ ساری چیزیں آپ کی دی ہوئی ہیں اور یہ سب آپ پر قربان ہیں۔ خلیفہ نے کہا اچھا۔ جاؤ۔ میں واپس آگیا تھوڑی دیر کے بعد پھر بلوایا گیا۔ میں پریشان تھا کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ خلیفہ بہت مضطرب اور پریشان ہے۔ میں پہنچا تو خلیفہ نے پھر وہی سوال دہرایا۔ میں نے کہا کہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے زیادہ آپ کو عزیز رکھتا ہوں۔ اس نے کہا جاؤ۔ لیکن پھر تھوڑی ہی دیر بعد پھر بلوایا گیا۔ اب میں ڈرا کہ خدا خیر کرے۔ اب جان کی خیر نہیں۔ میں پہنچا تو خلیفہ اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ مجھ سے پھر پوچھا کہ تم مجھ کو کتنا عزیز رکھتے ہو۔ میں نے عرض کی کہ اپنی جان اور اپنے مال اور اپنے ایمان سے زیادہ خلیفہ خوش

خوش ہو گیا۔ بیٹھ گیا۔ اپنی تلوار مجھ کو دی اور حکم دیا کہ قید خانے میں جاؤ اور جو قیدی بھی وہاں ملیں ان سب کی گردنیں اڑا دو اور ایک مشعل بردار کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس زمانہ میں سرکاری قید خانے شاہی محل میں ہوتے تھے۔ ایک کنواں ہوتا تھا اور اس میں چاروں طرف کمرے سلز cells ہوتے تھے۔ ایک ایک کوٹھری کھولی جاتی جس میں مرد عورتیں اور بچے تھے۔ جن کی صورتیں ایسی تھیں کہ دیکھتا ہی رہ جائے۔ میں ایک ایک کو تہ تیغ کرتا رہا میں پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ مگر خلیفہ کا حکم تھا۔ سب کو قتل کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو یا اس سے بھی زیادہ تھے۔ ایک بڈھا باقی رہ گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ تو اپنے ہاتھ میرے خون میں نہ رنگ۔ میں نے کہا کہ یہاں تو بڑے بڑے جوان قتل کر دیئے گئے تو اپنی زندگی کیوں بچانا چاہتا ہے جب تیرے دن تو ویسے بھی قریب معلوم ہوتے ہیں تو اُس مردِ بزرگ نے کہا کہ میں اپنے لئے نہیں تیری خاطر کہہ رہا ہوں کہ مجھ کو نہ مار کیونکہ قیامت کے دن جب رسولؐ اللہ تجھ سے پوچھیں گے کہ تو نے میرے بیٹے حسنؑ کی اولاد سے کسی کو زندہ بھی چھوڑا تھا یا سب کو قتل کر دیا تھا تو تُو یہ کہنا کہ ایک بڈھا رہ گیا تھا اور جب مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ آپ کے بیٹے حسنؑ کی اولاد ہے تو میں نے آپ کے خیال سے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ یہ سن کر میرے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ یہ تمام لوگ جن کو میں نے قتل کیا تھا یہ حسنؑ کی اولاد سے تھے اور مدینے سے لائے گئے تھے اور امام جعفرِ صادقؑ کی نگاہوں کے سامنے لائے گئے تھے اور اس وقت آپ کے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ اولادِ حسنؑ کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔

کربلا میں بھی حسنؑ کا نمائندہ ان کا بیٹا قاسم موجود تھا۔ اس

نے بھی حق کی راہ میں جان دے دی۔ جب اس نے امام حسینؑ سے رن میں جانے کی اجازت طلب کی تو امام نے پوچھا کہ موت کو تم کیسا سمجھتے ہو۔ قاسم نے جواب دیا: "آج شہد سے زیادہ میٹھی۔"

چھٹی مجلس

تمام حمد اللہ کے لیے ہے جو عالمین کا رب ہے۔ جو رحمٰن ہے جو رحیم ہے۔ جو عادل ہے جو یومِ دین کا مالک ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس کے عبد ہیں۔ اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور ہماری اس سے دعا ہے کہ ہم کو صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے اور اس پر قائم رکھے وہ صراط جو ان لوگوں کی صراط ہے جن پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوئیں۔ اور جو اس گروہ میں سے نہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور جو گمراہ ہیں بلکہ وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کے انعام نازل ہوئے۔

اور ہمارا درود ہو محمد مصطفیٰؐ پر وہ ذاتِ گرامی جس کے متعلق قرآن پاک یہ بشارت دیتا ہے کہ جو اس نبی کا اتباع کرے گا وہ اس جماعت میں شامل ہو جائے گا جو انبیا کی جماعت ہے۔ صدیقین۔ شہیدا اور صالحین کی جماعت ہے اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کتنی اچھی جماعت ہے۔ کتنی اچھی رفاقت ہے اور کتنے اچھے ساتھی ہیں۔

اور ہمارا اسلام ہو ائمہ اطہار پر جو محمد مصطفیٰؐ کے علم و حکمت و امر کے وارث تھے۔ جو تمام انبیا کے وارث تھے اور ہمارا اسلام ہو اور اللہ کی رحمتیں ہوں ان پر جنھوں نے ان ائمہ کی تصدیق کی جنھوں نے ان کے ساتھ شہادت اختیار کی جن کی زندگی صالح اور موت سعادت تھی۔

کل ہم امام حسنؑ کی صلح کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ امام حسنؑ نے یہ کہا تھا کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ میں نے ان کے لیے ایسی اچھی بات کی ہے کہ جس سے بہتر بات پر سورج طلوع نہیں ہوا اور نہ اس سے بہتر بات پر غروب ہوا میں نے ان کے لیے وہ کیا جو خضر نے کیا تھا۔ خضر نے ایک کشتی میں سوراخ کر دیا۔ ایک آدمی کو قتل کر دیا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کو کھڑا کر دیا۔ جناب موسیٰ اس پر بہت متعجب تھے مگر خضر نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے حکم سے کیا۔ اس میں اللہ کی بہت سی مصلحتیں شامل تھیں۔ یہ ترجمہ میں نے وہ کیا ہے جو خود امام حسنؑ نے فرمایا ہے۔ صلح حسن سے متعلق تفصیلات میں جانے ہر شرط کے متعلق توجیہات کرنے اور apologies پیش کرنے کے بجائے میں زیادہ گہرائی میں جاتے ہوئے خود امام حسنؑ کے ارشاد کی روشنی میں اس صلح کو سمجھنا چاہتا ہوں۔

اب خضر کے واقعہ کی طرف آیئے جو قرآن پاک میں موجود ہے بالکل لفظی ترجمہ پیش کرنے کی کوشش ہے۔ کلام پاک میں سورہ کہف میں جن الفاظ میں یہ قصہ بیان ہوا ہے اور جس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا جوان ساتھی کے لیے فتا کا لفظ ہے۔ اس جوان ساتھی فتا جناب موسیٰؑ کے وصی جناب یوشع ابن نون تھے (یہ فتا کا لفظ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وصی کے لیے بھی خاص طور پر استعمال ہوتا ہے (لافتا الاعلی لاسیف الاذوالفقار) حضرت موسیٰ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا کہ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ جب تک اس جگہ نہ پہنچ جاؤں جہاں دو بحر آپس میں ملتے ہیں" مجمع البحرین "خواہ سالہا سال گزر جائیں۔ میں اپنا یہ سفر جاری رکھوں گا۔ جب وقت وہ دونوں اس جگہ پہنچے

جہاں دو دریا ملتے تھے تو ان کے پاس ایک تلی ہوئی مچھلی تھی اس نے پانی میں اپنا راستہ بنایا اور چلی گئی۔ جب یہ دونوں آگے بڑھے تو جناب موسیٰؑ نے کہا کہ ہم تھک گئے ہیں۔ ذرا ناشتہ نکالو۔ جناب یوشع نے کہا آپ نے وہ دیکھا جس چٹان پر ہم لوگ بیٹھے تھے تو شیطان نے ہم کو یہ بھلا دیا اور وہ مچھلی پانی میں چلی گئی۔ جناب موسیٰؑ نے کہا کہ وہی تو بڑی نشانی تھی وہی تو جگہ تھی جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ پھر وہ اپنے نشان قدم پر واپس آئے اور اسی جگہ واپس پہونچے جہاں مچھلی پانی میں چلی گئی تھی۔ مفسرین کہتے ہیں کہ وہ مچھلی بھنی ہوئی تھی۔ مردہ تھی۔ مگر یہ قرآن میں نہیں ہے۔ جب وہ لوگ وہاں پہونچے تو انھوں نے ایک عبد کو دیکھا۔ ایک اللہ کے بندے کو دیکھا (جناب خضر کا نام نہیں ہے مگر مفسرین کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے جناب خضر تھے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت نازل ہوتی تھی اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے کچھ علم عطا کیا تھا۔ براہِ راست جو علم عطا ہوتا ہے اس کو علمِ لدنی کہتے ہیں) تو موسیٰؑ نے اللہ کے اس بندے سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں تاکہ اس علم سے تھوڑا سا حصہ مجھ کو بھی مل جائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخشا ہے۔ جناب خضر نے جواب دیا کہ تم اس علم پر صبر نہیں کر سکتے اور کیسے صبر ہو سکتا ہے جب آدمی کو اس کی خبر ہی نہ ہو۔ یعنی جتنا آدمی کا علم ہوتا ہے اتنا ہی اس کا ظرف ہوتا ہے اور اتنا ہی سمجھ سکتا ہے۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا کہ آپ ان شاء اللہ مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائیں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ اب یہ دونوں چل دیئے۔ اب اس کے بعد حضرت یوشع کا ذکر اس واقعے میں نہیں آتا ہے چلتے چلتے دونوں آدمی ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس اللہ کے بندے نے (جن پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوئی تھیں اور جن کو علمِ لدنی حاصل تھا) کشتی میں سوراخ کر دیا اور ایک تختہ توڑ دیا۔ اب حضرت موسیٰؑ جو صاحب شریعت تھے ان کو بہت حیرانی ہوئی اور پوچھا کہ آپ نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔ کیا

ارادہ یہ ہے کہ کشتی میں بیٹھنے والے سب دریا میں ڈوب جائیں۔ جناب خضر بولے کہ میں تم سے نہ کہتا تھا کہ تم صبر نہ کر سکو گے اور متحمل نہ ہو سکو گے اس بات کے جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے صبر کی حدود سے باہر ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی مجھے معاف کر دیجئے میں بھول گیا تھا میرا عذر قبول کیجیے۔ اب انشا اللہ ایسی بات نہ ہوگی۔ آگے چلے تو ایک نوعمر لڑکا ملا خضر نے اس کو مار ڈالا۔ پہلے تو کشتی میں سوراخ کرنے کی بات تھی اور اب تو نبی کے سامنے ایک قتل ہوگیا جس کا بظاہر کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ موسیٰ سے ضبط نہ ہو سکا اور کہا کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو قتل کر دیا بغیر قتل کی حجت پوری کیے۔ بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو مارا ہو۔ آپ نے تو ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔ جناب خضر نے پھر وہ بات یاد دلائی کہ میں کہتا نہ تھا کہ تم سے صبر نہ ہو سکے گا تم اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جناب موسیٰ نے معافی چاہی اور کہا کہ اگر آئندہ ایسی بات ہو تو آپ بے شک معاف نہ کریں۔ پھر یہ دونوں آگے بڑھے اور چلتے چلتے ایک گاؤں میں پہونچے۔ وہاں کے لوگ عجیب سے تھے یہ دونوں بھوکے تھے مگر کسی نے کھانے کو نہ پوچھا۔ اس گاؤں میں جب آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک دیوار ہے جو گرا ہی چاہتی ہے۔ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ آؤ اس دیوار کو کھڑا کرنا ہے۔ اب موسیٰ ... سوچ رہے ہیں کہ یہ دیوار کیوں کھڑی کی جا رہی ہے اور کچھ تو کہہ نہ سکے اتنا ضرور کہا کہ اگر دیوار بنانا ہی تھی تو کچھ اجرت ہی لے لیتے تاکہ کچھ کھا لیتے ہم دونوں بھوکے ہیں۔ ان لوگوں نے تو کھانے کو بھی نہیں دیا اس پر خضر بولے "ھذا فراق بینی و بینک" موسیٰ بس اب ہمارے تمہارے راستے جدا ہو گئے۔ تمہارا دوسرا راستہ ہے میرا دوسرا راستہ ہے۔ لیکن جدا ہونے سے پہلے تم کو یہ بات ضرور بتا دوں کہ جو کچھ تم نے دیکھا اس کا مطلب کیا تھا۔ جس کشتی میں میں نے سوراخ کیا تھا وہ ایک مسکین کی کشتی تھی۔ اور یہی اس کا ذریعہ

معاش تھی۔ جزیرہ کا حاکم جو بھی سالم اور اچھی کشتی دیکھتا زبردستی اس پر قبضہ کر لیتا۔ میں نے اس لیے اس میں سوراخ کر دیا کہ اس مسکین کی کشتی اس ظالم کے ہاتھ نہ لگے اور مسکین کی روزی کا ذریعہ برقرار رہے۔ اور جس لڑکے کو میں نے مار ڈالا تھا وہ بد طینت اور کافر تھا۔ بڑا ہو کر اپنے والدین پر حاوی ہو جاتا جو بہت مومن اور صالح ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ ان کو اس کا نعم البدل دے گا جو بہت نیک اور صالح ہوگا اور والدین کی بہت خدمت کرنے والا ہوگا۔ اب رہی وہ بات کہ ہم نے ایک دیوار کی مرمت کر کے اس کو مضبوط کر دیا۔ جب کہ گاؤں والوں نے ہم کو کھانے تک کو نہ دیا تو اس گاؤں میں دو یتیم رہتے ہیں جو نابالغ ہیں اور ان کا باپ ایک خزانہ دفینہ چھوڑ کر مر گیا ہے اور وہ دفینہ اس دیوار کے نیچے ہے۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو گاؤں والے اس دفینہ کو لوٹ لیتے اور ان یتیموں کو کچھ نہ ملتا۔ ہم نے دیوار کی مرمت کر دی۔ جب وہ دونوں یتیم بالغ ہو جائیں گے تو دفینہ ان کو مل جائے گا۔ پھر حضرت خضرؑ نے کہا میں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اللہ کے حکم سے کیا ہے۔ یہ حضرت موسیٰؑ کا واقعہ ہے جو قرآن پاک میں ہے۔ اب امام حسنؑ کی بات پر غور کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے حکم سے کیا یہ لوگوں کو معلوم نہیں ہے۔ میں نے وہ کیا جو خضر نے کیا تھا۔ پھر تینوں واقعات کا ذکر کیا۔ یعنی کشتی میں سوراخ کرنا، لڑکے کو بغیر ظاہری وجہ کے مار ڈالنا اور ایک گرتی ہوئی دیوار کی مرمت کرنا۔ اب ذرا غور کیجئے کہ امام کی بصیرت کیا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا امر کیا ہوتا ہے۔ امام حسنؑ کی امامت اور ان کی حیران کن عظمت کی معرفت حاصل کیجئے۔ اب صورت یہ ہے کہ معاشرہ کا مزاج اور کیرکٹر بدل گیا ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ ادھر تنخواہ دار سپاہی ہیں اور ادھر کے لوگ بھی یہاں تک لوٹ مار کے عادی ہیں کہ امام حسنؑ کے پیروں کے نیچے سے ان کا مصلیٰ بھی کھینچ کے لے گئے۔ اور کہا یہ جاتا ہے کہ امام حسنؑ کے پاس لشکر تھا۔ ان کے پاس تمام کی تمام فوج تھی اس کے باوجود ان کی طبیعت اتنی صلح پسند

تھی کہ معاویہ سے صلح کرلی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ معاویہ اچھی طرح حکومت کر سکتے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں میں امن پیدا ہو جائے گا۔ اور اس بنا پر معاویہ نے جو کچھ بھی کیا وہ سب justification ہو کر ان کا Nash out ہو جاتا ہے۔ یہ بات جہلا کی نہیں بلکہ ایک مستقل موقف ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب ذرا حضرت امام حسنؑ کی باتوں پر غور کریں۔ آپ فرماتے ہیں کہ اگر اس وقت میرے پاس چالیس آدمی بھی ایسے ہوتے کہ جو قربتہً الی اللہ اور فی سبیل اللہ جہاد کے لیے تیار ہوتے تو میں ان کو لے کر جہاد کرتا۔ اب صورت یہ ہے کہ جس وقت کسی معاشرے کا مزاج بگڑ جاتا ہے تو جو کچھ اصلاح ہو سکتی ہے وہ اس مزاج کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس معاشرہ کی قلب ماہیت ہو جائے۔ اور خاص کر اس وقت جب معاشرہ کسی خاص نہج پر ترقی پذیر ہو۔ ملک فتح ہو رہے ہیں دولت آرہی ہے۔ خوش حالی بڑھ رہی ہے۔ ایک Affluent society بن گئی ہے اس وقت اس کی قلب ماہیت نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آپ امریکہ کے Affluent Society میں رہنے والے سے کہنے کی آپ کی نجات تو فقر میں ہے تو یہ بات قابل قبول نہیں ہو گی البتہ تھوڑی اصلاح ہو سکتی ہے جس رخ پر معاشرہ چل پڑا ہے اور اس رخ پر دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہیں یعنی حکومت بھی اور دولت بھی۔ اور آپ چاہیں کہ اس کا رخ بدل دیں تو یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس رخ کی ساری برائیاں پوری طرح آشکارا نہ ہو جائیں۔ جب یہ سائیکل پوری ہو جائے تب تبدیلی آسکتی۔ ورنہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ملک حاصل کرتا ہوا معاشرہ دولت حاصل کرتا ہوا اور آگے بڑھتا ہوا معاشرہ بالکل اپنا رخ بدل دے۔ تو اگر یہ باہمی جنگیں جاری رہتیں تو معاشرہ میں خانہ جنگی war ہو جاتی۔ Civil war کوئی بری چیز نہیں بشرطیکہ متصادم گروہوں کا موقف متضاد ہو اور پوری طرح سے واضح ہو۔ اس سے مسئلہ کچھ حد تک حل

ہو جاتا ہے لیکن اگر یہ ہوکر ادھر کے آدمی بھی لوٹ مار کے دلدادہ ہوں اور ادھر کے آدمی بھی تو امام حسنؑ ایسے لوگوں کو کیا ٹھیک نہیں کر سکتے۔ امام کی حیثیت کے متعلق حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ اس کی حیثیت ایک چشمہ جیسی ہے۔ پیاسے لوگ اس کے پاس آتے رہیں وہ خود پیاسوں کے پاس نہیں جاتا۔ محمد مصطفٰےؐ تو رسول ہیں اللہ کے رسول اور مسلمانوں کے لئے بھی رسولؐ جن میں گناہ گار بھی ہیں اور نیکوکار بھی۔ اچھے بھی ہیں برے بھی ہیں لیکن امام کی حیثیت جداگانہ ہے۔ مثلاً حضرت علیؑ امیر المومنین ہیں۔ مومنوں کے سردار ہیں گناہ گاروں کے نہیں تو صورت یہ ہوتی کہ اگر ... نازل ہوتی تو جہاد کی روح تو پہلے ہی بہت کچھ ختم ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ باقی رہتا کا امکان تھا وہ بھی ختم ہو جاتا۔ اور زیادہ توقع اس بات کی تھی کیوں کہ معاویہ کی تدبیریں کارگر ہو سکتی تھیں مگر معاشرہ اب دین کی پابندیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شخص جو ایک ہاری ہوئی جنگ کو اپنی چالوں سے فتح میں بدل سکتا ہے۔ جنگ صفین کی ہاری ہوئی جنگ واقعہ ثالثی کے Arbitration کے ذریعے فتح میں تبدیل ہو گئی اور معاملہ کا Arbitration تک پہنچنا ہی معاویہ کی کامیابی تھی۔ حضرت علیؑ تو اسی طرح خلیفہ ہوئے تھے جیسے کہ ان سے پہلے والے ہوتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے اتمام حجت کے لئے معاویہ کو لکھا تھا کہ تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے کیونکہ جس طرح پہلے خلیفہ ہوتے تھے اسی طرح میں بھی خلیفہ ہوا ہوں۔ تو وہ جو کہ جائز خلیفہ تھا اس کے مقابلے میں معاویہ کو جو mere nobody تھا یہ مقام حاصل ہوا کہ اس کے اور خلیفہ کے مابین کے درمیان Arbitration قرار پائے یہ ایک ہاری ہوئی جنگ کے بعد بہین فتح تھی تو اب دیکھیے کہ اگر امام حسنؑ معاویہ سے جنگ کرتے اور معاویہ کو فتح ہوتی تو پھر اس کا یہ دعویٰ ہوتا کہ میں نے تو جنگ میں شکست دے کر بادشاہت حاصل کی ہے تو اس وقت اسلام کا نام لینے والے کہاں جاتے۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جو قتی تباہی آ چکی تھی تو

اسلام کو سلامت کیسے رکھا جائے۔ یہ کشتی جس کا نام اسلام ہے یہ مسکینوں کا آسرا ہے اس میں عیب تو واقعی پیدا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کشتی ٹوٹ گئی۔ جس طرح خضر نے کشتی میں عیب پیدا کر دیا تھا۔ تو اس میں شک نہیں کہ امام حسن سے زیادہ کون واقف ہوگا اور آپ کے ساتھی بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ کیا اسلام کی بدبختی ہے کہ اس کا سربراہ معاویہ جیسا آدمی ہے تو اس کشتی میں عیب تو آ گیا لیکن کوئی تدبیر اس بات کی ضرور ہو گئی کہ اب یہ کشتی بچائی جا سکتی ہے۔ اس کا طریقہ کچھ اور ہوگا۔ ظالموں سے کشتی کے بچانے کا طریقہ لیکن ظالموں کے ہاتھ میں جانے سے یہ کشتی اب بچ گئی۔ خضر نے کشتی میں سوراخ کر کے عیب ڈال دیا تھا جس پر موسیٰ نے کہا تھا کہ کیا ارادہ ہے۔ کیا سب کو ڈبونا ہے اور یہاں جو امام حسنؑ کے چند وفادار ساتھی ہیں انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ مولا یہ کیا کیا آپ نے۔ آپ نے تو مسلمانوں کو ڈبو دیا۔ ہم تو کہیں کے بھی نہ رہے۔

اب دوسری منزل پر آئیے حضور اکرمؐ کے زمانہ میں دینِ اسلام بھی آیا اور حکومت بھی۔ اس لئے کہ حضور دنیاوی حکمراں بھی تھے یعنی ایک طرف دین کی روایت پیدا ہوئی فقر کی روایت پیدا ہوئی۔ اللہ سے لَو لگانے کی روایت پیدا ہوئی۔ دوسری طرف حکومت کی روایت بھی پیدا ہوئی۔ تاریخی طور پر شیعانِ علیؑ کا موقف کیا ہے یہیں آ کر بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور تمام جھگڑا شخصیات پر شروع ہوتا ہے۔ تو گرفتارِ ابوبکر و علی" شیعہ کہتے ہیں کہ خلافت پر حضرت علیؑ کا حق تھا لیکن بنی سقیفہ میں لوگوں نے سازش کر کے وہ حق ان سے چھین لیا تھا۔ کسی دوسرے آدمی سے آپ یہ بات کہیں تو وہ کہے گا کہ دنیا میں بہت لوگوں کا حق چھینا گیا ہے۔ دنیا کی سیاست ہی یہ ہے۔ علی نہیں ہوئے اور ابوبکر ہو گئے تو کیا فرق پڑا تو شخصیتوں میں گھرے رہنے کی بات بہت گہری ہے۔ یہ مزاج، نظریہ اور دین کی تاریخ کے اندر فرق آ جاتا ہے

آپ کو معلوم ہے کہ حضور اکرم کے عہد میں جب سقیفہ نہ تھا تو یہ فرق نمایاں
ہو چکے تھے کچھ ہستیاں ایک دوسرے سے متضاد نظر آنے لگیں تھیں۔ اور بہت
لوگ اللہ والے تھے جنھیں اپنی بدقسمتی سے ہم بھول چکے ہیں۔ اور جن کو یاد نہیں
کرتے۔ جناب سلمان فارسی، جناب ابوذر، جناب عمار یاسر، جناب مقداد، جناب
حذیفہ یمنی، جناب جابر ابن عبداللہ، جناب ابو ایوب انصاری، جن کا کیریکٹر اور کردار
نمایاں حیثیت سے جداگانہ تھا اور وہ ایک علیحدہ ہی حلقہ تھا۔ اس کو یوں سمجھو کہ جیسے
اللہ کی رحمتیں ہیں بارش اور دھوپ جس پر تمام زندگی کا قیام ہے اور ہر چیز اپنے
ظرف اپنے مزاج، اور اپنے جذب کے مطابق اس سے فیض حاصل کرتی ہے اور کچھ
چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو بارش یا دھوپ سے نقصان پہنچتا ہے۔ تو ہر آدمی اور ہر گروہ
اپنے مزاج اور اپنی سمجھ کے مطابق دین سے فیض حاصل کرتا ہے۔ یہ محض شخصیتوں کی
بات نہیں۔ رسول اللہ کے بعد حضرت علیؑ کا خلیفہ نہ ہونا یہ کوئی اتفاق یا [illegible]
بات نہیں اس کے پیچھے ایک پوری داستان ہے۔ طبیعتوں کا اختلاف، ارادوں کا اختلاف
مزاجوں کا اختلاف اور ان گہرائیوں میں ہم کو اپنی خصوصیات کو تلاش کرنا ہے تو یہ دو روش
لائنیں، یہ دونوں روایتیں اسلام سے نکلیں۔ یعنی ایک روایت یہ ہے کہ اللہ کی
راہ میں سب کچھ قربان کرنے اور [illegible] کی زندگی بسر کرنے کی اور دوسری
حکومت کی۔ بادشاہت کی اور شان و شوکت کی۔ اس کو یوں سمجھو کہ دین اسلام ایک
صالح اور مومن باپ ہے جس کے دو بیٹے ہیں۔ ایک بیٹا جو حکومت اور شان و شوکت
اور بادشاہت کی روایت کا مجموعہ ہے اور ایک بیٹا علم، حکمت، خدا کی رضا، تزکیہ
نفس، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روایت کا مجموعہ ہے۔ اب ذرا
اس قصہ پر غور کرو کہ حضرت خضر نے جس لڑکے کو مارا تھا۔ وہ تھا تو ایک مومن اور
صالح باپ کا بیٹا لیکن اگر وہ زندہ رہتا تو اپنے عیال اور اپنے کفر سے اپنے باپ

پر غالب آجاتا۔ یہ الفاظ کلام پاک کے ہیں۔ یعنی تمام اسلام پر سخت حکومت اور Imperialism
کے ہو جائیں گے اور یہ بیٹا جو اسلام کے گھر میں پیدا ہوا ہے یعنی امپریلزم ، وہ غالب
آجائے گا اور دین کی صحیح روایات اس میں ختم ہو جائیں گی ۔۔ اور ہماری جانیں قربان ہوں
امام حسنؑ پر جنہوں نے اپنی بصیرت سے اسلام کے اس بیٹے کو بچایا یعنی دین حنیف
اور اس کو اپنی جگہ پر رکھا تاکہ آگے چل کر انہی دو بیٹوں کے درمیان جنگ ہوگی اور پھر
لوگ طے کریں گے کہ اسلام کی حقیقی روایات کیا ہیں آیا وہ جو معاویہ ، یزید ، یا دوسرے
بادشاہوں سے چلیں یا وہ روایات جو امام حسنؑ اور امام حسینؑ سے ملتی ہیں اور
ان سے جنہوں نے ظالموں کے دربار میں حرفِ حق بیان کیا اور ان کی روایتیں جو
فقیر ہیں saints ہیں اور جن کی زندگیاں جیل خانوں میں گزر گئیں اور جن پر حق پرستی
کے جرم میں جابروں نے ظلم کیے اس وقت فیصلہ ہوگا کہ شریف اور صالح بیٹا کون ہے
اور سرکش اور نافرمان بیٹا کون ہے۔ امام حسنؑ نے صلح کر کے اس سرکش بیٹے کو باپ
پر غالب آنے سے روک دیا۔

تیسری بات جو خضر کی تھی وہ ایک گرتی ہوئی دیوار کو سیدھا کر دیا تھا۔ اکثر
مفسرین کا خیال ہے دیوار کے نیچے جو خزانہ تھا اس میں باپ کی وصیت بھی تھی اور
اس میں کلمہ لکھا ہوا تھا لا الہ الا اللہ ۔ اس کے علاوہ تین وصیتیں بھی تھیں ۔ اور اس کی
خواہش تھی کہ جب یہ بچے بڑے اور بالغ ہو جائیں تو یہ خزانہ ان کو ملے۔ حضرت خضر
کو ڈر یہ تھا کہ اگر یہ دیوار گر گئی تو یہ گاؤں والے جن کے چلن یہ ہیں کہ بھوکے مسافروں
کو کھانا بھی نہیں دیتے وہ پورا خزانہ ہڑپ کر بیٹھیں گے۔ گویا خزانہ لٹنے کا ڈر تھا
اور ابھی حالات mature اور پختہ نہیں ہوتے تھے کہ خزانہ ظاہر ہوتا۔ ذرا حالات
کی پختگی تک بات پہنچ جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ حالات پختہ ہونے سے پہلے تمام کا تمام
دین ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ جو تنخواہ دار یا ہی دونوں طرف ہیں

اور جن پر جابر مسلط ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کے ہاتھ یہ خزانہ لگ جائے اس خزانے کو ابھی محفوظ رکھنا ہے تاکہ situation ذرا mature ہو جائے وہ یتیم بالغ ہو جائے تو اپنے صالح اور مومن باپ کی وراثت اس کو مل جائے۔ قرآن شریف میں اس واقعہ میں بہت رموز پنہاں ہیں۔ میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اگر امام حسنؑ معاویہ سے صلح نہ کرتے تو کربلا نہ ہو سکتی تھی۔ ناممکن تھا۔ اس واقعہ کی تمثیل کی زبان میں کشتی ظالموں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی۔ اور وہ سرکش اور نافرمان بیٹا اپنے باپ کا گلا گھونٹ چکا ہوتا۔ اور وہ خزانہ جو ایک خاص وقت تک کے لئے دیوار کے نیچے دفن تھا اس گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں کب کا لٹ چکا ہوتا اور حق دار تک نہ پہنچ پاتا۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ معاشرہ کی حالت ایسی بدل چکی تھی تھی کہ امام حسن کے نیچے سے جانماز تک کھینچی جا چکی تھی اور ان کو زخمی بھی کر دیا گیا تھا۔ یہ بڑا المیاتی واقعہ ہے جس سے مسلمانوں کے کردار کا پتہ چلتا ہے کہ معاشرہ کس حد تک خراب ہو چکا تھا اور دولت نے لوگوں کو کس قدر اندھا بنا دیا تھا۔

ایک دوسرا نکتہ قابل غور یہ ہے کہ ہر موقع پر حق و باطل کی جنگ کا ذکر کیا جاتا ہے مگر ہمارے معاشرے میں صورت یہ ہوتی ہے کہ نہ پورا حق ایک طرف ہوتا ہے اور نہ پورا باطل دوسری طرف ہوتا ہے کیفیت کچھ ملی جلی سی ہوتی ہے کہ یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ حق کون سا ہے اور باطل کون سا ہے۔ ایک confusion جیسی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ جو بڑے اور اہم سوالات پیدا ہوئے ان پر پوری طرح غور کرو تو معلوم ہوگا کہ حق پوری طرح سے تمہاری طرف بھی نہ تھا اور وہ سب جو تمہارے دشمن تھے اور جن سے تمہارا confrontation ہوا مکمل طور پر باطل وہ بھی نہ تھے۔ بلکہ کچھ حق و باطل ادھر تھا اور کچھ حق و باطل تمہاری طرف تھا اور یہ حق و باطل آپس میں کچھ اس طرح ملے جلے تھے کہ حق سے باطل کو شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب

اس واقعہ کو دیکھو جو امام حسنؑ اور معاویہ کے درمیان پیش آیا۔ امام حسنؑ کے ساتھ کچھ افراد تو بے شک وفادار تھے لیکن جہاں تک فوجوں کا تعلق ہے تو دونوں طرف کی فوجوں کے کردار میں کوئی فرق نہ تھا۔ جنگِ صفین میں جن لوگوں نے حضرت علیؑ کو Arbitration پر مجبور کیا تھا وہ وہی لوگ تھے جو آپ کی طرف سے جنگ میں شریک تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے نہروان میں آپ کے خلاف جنگ کی تو جہاں تک فریقین کی فوجوں کا سوال ہے تو ان میں کوئی فرق نہیں۔ وہ تو مسلم معاشرہ تھا اور اس کی کیفیت جو ہو گئی تھی وہ ظاہر ہے نہ کسی کو حق کا پتہ نہ باطل کا۔ ایک elite سوسائٹی ہے جس کی حکومت ہے۔ نیچے والے جو ہیں وہ کوشش کر رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت جمع کر لی جائے۔ یہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ کی ہمیشہ خصوصیت ہوتی ہے جو کم و بیش ہمارے معاشرہ میں بھی ہے کہ ایک حکمراں طبقہ ہے اور دوسرے نیچے والے جن کی کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرے اور ہوس پوری ہوتی رہے۔

اب ایسے معاشرہ میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی نیک آدمی اوپر نہیں آسکتا اور نہ اس کا مقام ایسا ہوتا ہے کہ اس کی بات سنی جا سکے۔ امام حسینؑ نے فرمایا کہ ایسا زمانہ بھی آجاتا ہے کہ مردِ مومن لقائے الٰہی کی تمنا کرے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسے معاشرہ میں رہنے میں ذلت محسوس کرے۔ تو عزیزو سب سے بڑی بات جو تھی وہ یہ کہ حق و باطل میں جو confusion ہو رہا تھا وہ دور کیا جائے۔ اور لوگ حق و باطل کو صاف طور سے پہچان لیں۔ تو امام حسنؑ نے اس کے لئے کیا کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ظلم چلنے دو۔ اگر میرے ساتھ جو لوگ بظاہر ہیں ان میں چالیس آدمی بھی ایسے ہوں جو فی سبیل اللہ کے لئے تیار ہوں تو میں جہاد کروں لیکن اس وقت تو چالیس آدمی بھی نہیں ہیں لیکن جب ظلم بڑھتا گیا اور حق و باطل کا فرق

ظاہر ہو تا گئی تو ان کے بھائی حسینؑ نے اس کے عوض ستر آدمی جمع کر لیے اور جیسا کہ امام حسنؑ نے کہا تھا کہ اگر چالیس آدمی بھی ہوتے تو میں جہاد کرتا تو اب ان کا چھوٹا بھائی ان ستر آدمیوں کو لے کر جہاد کر کے دکھا رہا ہے جب حق و باطل بالکل الگ ہو جائیں جب حق میں باطل کا کوئی شائبہ نہ رہے اور حق کی تائید کرنے والوں میں باطل کا کوئی عکس نہ ہو اس وقت حق کی کیا طاقت ہوتی ہے۔ امام حسنؑ نے اپنے عمل سے اس کے امکان کو پیدا کیا اور ممکن بنا دیا۔

اس صلح کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب امام حسنؑ نے صلح کر لی تو پھر معاویہ جائز حکمران بن گیا، حق دار ہو گیا۔ یہ بات وہ ہے کہ ہر جابر و ظالم کو ئی اسے دہرایا کرتا ہے کہ یہ جو کچھ میرے پاس ہے یہ اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور یہ بات اس زمانہ سے چلتی ہے جب یزید نے تخت پر بیٹھ کر یہ آیت پڑھی تھی اللھم مالک الملک۔ توتی الملک من تشاء و تنزع الملک من تشاء تاکہ اپنی حکومت کا جواز ثابت کرے۔ اور کہا کہ یہ جو کچھ مجھ کو دیا ہے اللہ نے دیا ہے اس زمانہ سے لے کر آج تک ہر جابر و ظالم حکمران اور بادشاہ یہ ضرور کہتا ہے کہ میں تو یہاں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے آیا ہوں کیوں کہ اس کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہو سکتا اب خواہ وہ غصب کر کے۔ قتل و غارت کر کے، دھوکہ دے کر جیسے بھی آیا ہو۔ امام حسنؑ بتا رہے ہیں کہ معاشرہ کی اصلاح کی صورت یہی ہے کہ اس جھگڑے کو بند کیا جائے جو معاشرہ کو پست کرتا چلا جا رہا ہے اور اخلاق کو بگاڑتا چلا جا رہا ہے اور میں اس قابل نہیں کہ ایسے معاشرے کی سربراہی کر سکوں وہ معاویہ ہی ہے جو ایسے معاشرے کی سربراہی کر سکتا ہے۔ تو یہ سمجھنا غلط ہے کہ امام حسنؑ نے اپنا حق معاویہ کو دے دیا تو اس کے لئے حکومت کرنے کا جواز پیدا ہو گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص غصب کرکے، جبر کر کے، حالات کو خراب

کر کے بادشاہ بن جائے یا خلافت کی جگہ پر پہنچ جائے۔ اس کو Authority مل جائے اور وہ اس کے جواز میں کہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ میں جس مقام پر ہوں وہ اللہ کی مرضی سے ہے۔ تو صلح حسنؑ سے معاویہ کی خلافت جائز ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالات کو اتنا خراب اور معاشرہ کو اتنا Degenerate کر دیا گیا تھا کہ امام حسنؑ نے اس کو اپنی پشت پا سے مار کر علیحدہ کر دیا تھا۔ بقول اقبال بیکار دگیں۔ پشت پا زد بر سر تاج و نگیں اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اب وہ ظلم جاری ہے صلح حسن سے لے کر واقعہ کربلا تک کی تاریخ پر غور کرو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تم کو فخر بھی محسوس ہوگا اور تکلیف بھی ہوگی جب تم یہ دیکھو گے کہ حضرت علیؑ کے نام لینے والے رسول اللہؐ کے بزرگ صحابی حجر بن عدی کے ساتھ کیا ہوا۔ میثم تمار اور رشید ہجری کے ساتھ کیا ہوا۔ حجر بن عدی کا واقعہ یہ ہے کہ کوفہ کی مسجد میں حضرت علیؑ کے خلاف کھلم کھلا باتیں کی جاتیں تھیں۔ اسلام کی ایک مسخ شدہ تصویر پیش کی جاتی تھی۔ حجر بن عدی کہتے تھے کہ لوگو! گمراہ نہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں تمہاری آنکھوں پر پردے ڈالے جا رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں تم گمراہی کی طرف لے جائے جا رہے ہو۔ اس حرفِ حق بیان کرنے کا انعام سوسائٹی نے یہ دیا کہ حجر بن عدی اور ان کے ساتھی شام کے دربار میں پابجولاں پہنچے۔ وہاں ان سے کہا گیا کہ اگر تم دین سے پھر جاؤ یعنی علیؑ کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہو اور ہماری طرف آجاتے ہو تو تم کو انعام بھی ملے گا اور عہدہ بھی ملے گا دولت بھی ملے گی ورنہ تمہاری جان سلامت نہیں۔ جناب حجر بن عدی نے انکار کیا اور قتل سے پہلے نماز کی مہلت چاہی۔ یہ مالک سے ملاقات سے قبل آخری نماز بھی عجیب ہے جس کا پورا نمونہ کربلا میں سامنے آتا ہے۔ کافر حجر بن عدی سے کہتے ہیں کہ ہاں پڑھ لو۔

اگر موت سے بچ سکو تو پڑھ لو۔ یہاں دو نظریوں کا فرق دیکھو ایک وہ کہ جس میں بڑی سے بڑی آفت اور لعنت موت ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس سے بچتا ہے اور ایک نظریہ وہ ہے کہ موت کو گلے لگایا جا رہا ہے اور اس کے لئے تیاری کی جا رہی ہے کہ موت تو لقائے الہٰی کا بہانہ ہے۔ نماز کے بعد حجر بن عدی فرماتے ہیں کہ قسم خدا کی اس وقت مجھ کو نماز میں ایسی لذت آ رہی تھی کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کو طول دیئے جاؤں لیکن اس خیال سے کہ تم یہ نہ کہو کہ موت سے بچنے کے لئے میں ایسا کر رہا ہوں میں نے نماز ختم کر دی۔ اس کے بعد وہ قتل کر دیئے گئے۔ اور اس واقعہ پر خود بی بی عائشہؓ کو جو معاویہ کی طرف دار تھیں غصہ آیا اور فرمایا کہ رسول اللہؐ کے ایسے پرہیزگار صحابی کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ اب جب کہ فسق و فجور و ظلم نمایاں ہو گیا تو یہ بات ممکن ہو گئی کہ صالحین اور صدیقین کی جماعت اب تیار ہو سکتی ہے خواہ وہ جماعت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ انبیاؑ شہدا۔ صالحین اور صدیقین کی جماعت کے متعلق میں عرض کروں گا کہ آپ نماز میں صراطِ مستقیم کی جو دعا مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی شناخت شخصیتوں ہی کے ذریعے کی ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ صراطِ مستقیم تقویٰ کی صراط ہے یا نماز، روزہ، زکوٰۃ یا قرآن کی صراط ہے بلکہ کہا یہ گیا کہ ہر ان لوگوں کی صراط ہے جن پر میری نعمتیں نازل ہوئیں اور پھر اس کلامِ پاک میں وضاحت کی ہے کہ نعمتیں کن کن پر نازل ہوئیں وہ جو میرے رسول کا اتباع کرتے ہیں وہ ان لوگوں کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں جن پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور بتایا جاتا ہے کہ وہ انبیا ہیں۔ شہدا ہیں۔ صدیقین ہیں اور صالحین ہیں اور یہ کتنی اچھی جماعت ہے۔ کتنی اچھی رفاقتیں ہیں اور کتنی اچھی دوستی ہے۔ اور کتنی اچھی سعادت ہے اگر کوئی شخص اس جماعت میں شامل ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم کی

تعریف یوں کرتا ہے۔ اچھے معاشرہ اور اچھی جماعت کی خصوصیات یہ ہیں۔ اب ان الفاظ پہ ذرا غور کیجیے انبیا۔ نبی خود ہے۔ امام ہے کیونکہ نبی کی تعلیم کسی نہ کسی صورت سے ہو کیونکہ خیر کا تمام سرمایہ وہ نبی کی تعلیم ہے جو نبیوں کے ذریعے سے اللہ کے بندوں تک پہونچی ہے۔ اگر نبی موجود ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت ہے اگر امام موجود ہے جو وارث نبی ہے تو اللہ کی برکت و رحمت ہے کیونکہ وہ ہدایت جو نبی اور امام کے ذریعے سے ہوتی ہے اس کا وجود لازمی ہے۔ اگر وہ نہیں ہے تو معاشرہ کا جسم ہے مگر روح ختم ہو چکی ہے۔ نبی کے معنی ہیں خبر رکھنے والا۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والا۔ یہ خبر یہ حقیقت ورثہ ہے۔ یہ امانت ہے جو ہمارے سینوں میں ہے یا ہونی چاہیے اور اگر خدانخواستہ ہمارے سینے اس امانت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ تو پھر دین کے الفاظ میں اس ظلمت اور تاریکی سے بڑی کون سی ظلمت ہو سکتی ہے جو لوگوں کے سینے سے نکل کر دنیا میں پھیلے۔ اور اس معاشرہ میں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی تصدیق کرنے والے ہوں۔ جو اس امانت، اس حقیقت اور اس روح کی تصدیق کرنے والے ہوں۔ صدیق زبان سے تصدیق کرنے والے کو نہیں کہتے بلکہ اس کو کہتے ہیں جو خبر نبیوں کے ذریعے سے آئی ہے اس حقیقت کا اس کو بھی تجربہ ہوا ہو۔ اور اس وقت وہ کہے کہ ہاں بے شک یہ ٹھیک ہے۔ نبی کہتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ہے۔ اور صدیق وہ ہو سکتا ہے جس نے زندگی بھر اس حقیقت کا تجربہ کیا ہو اور وہ کہے کہ واقعی اللہ کے سوا اور کوئی اللہ نہیں ہے۔ اور اس کا ایک ایک رونگٹا گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے سچ کہا۔ ایسے آدمی کو صدیق کہتے ہیں۔ عزیز یہ وہ تصدیق ہے جو حضرت عباسؑ امام حسینؑ کی کیا کرتے تھے۔ یا حضرت علیؑ رسول خدا کی کیا کرتے تھے اور صالح میں دو خصوصیات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ طبعاً نیک ہوتا ہے اور

دوسری یہ کہ وہ مزید نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بنی ہاشم کے جوانوں کو دیکھو۔ میدان کربلا میں یہ چھوٹے بڑے، جو ان سب موجود تھے جو فطرتاً نیکی کی طرف مائل تھے اور جن کی طبیعت میں کسی طرح کی کجی یا اوچھے پن کا دخل ہی نہ تھا۔ اور ایسے لوگوں کو ان کی نیکی کی صلاحیت کی بنیاد پر صالح کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہی spiritual fitness ہے کہ جب جان دینے کا موقع آئے تو ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش ہو۔ اس کی کوشش ہو کہ ہم سے کوئی آگے نہ بڑھ جائے۔ امام حسینؑ سفر فرما رہے ہیں۔ راستہ میں قیام کیا۔ جب سو کر بیدار ہوئے تو حضرت علی اکبرؑ نے دیکھا کہ باپ کی طبیعت کچھ بوجھل ہے۔ دریافت کیا بابا جان کیا بات ہے۔ امام نے جواب دیا بات تو کچھ نہیں ہے۔ میں نے خواب میں سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ دیکھو یہ لوگ کتنی جلدی جلدی موت کی طرف جا رہے ہیں اور موت ان کی جانب استقبال کے لیے بڑھ رہی ہے جناب علی اکبر نے پوچھا۔ بابا جان کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ امام نے فرمایا کہ خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں تمہارے باپ کی جان ہے ہم حق پر ہیں۔ تو بیٹے نے کہا کہ پھر کیا ہے۔ جب ہم حق پر ہیں تو پھر کیا ہے اگر ہم موت کی طرف بڑھیں یا موت ہماری طرف بڑھے۔ یہ طبیعت صالح کی نشانی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ کہ صالح ہونے کی صلاحیت ہے کہ نہیں۔ جس وقت حقیقت اس کے سامنے پیش کی جائے تو طبیعت اس طرف مائل ہو۔ تو ایسی طبیعت حرؑ کی تھی اور ان لوگوں کی تھی جو یزیدی لشکر چھوڑ کر امام حسینؑ کی طرف آئے۔ بغیر صالح فطرت کے کوئی ایسا نہیں کر سکتا کہ زندگی پر موت کو ترجیح دے اور محض حق کی طرفداری کے لئے جان دے۔ مگر ہمارا اسلام ہو کر اس نے بشر کا احترام رکھ لیا اللہ تعالیٰ کے سامنے۔ دیکھو امام جو کرۂ ارض پر خدا کی آواز ہے وہ لوگوں کو بتا

رہا ہے کہ حق کدھر ہے ایمان کدھر ہے اور کفر و باطل کدھر ہے۔ امام لوگوں
کو حق کی دعوت دے رہا ہے اور اگر اس آواز پر (جو دراصل حسینؑ کی آواز
نہ تھی بلکہ خدا کی آواز تھی) اگر ایک بشر بھی اس کا اثر نہ ہوتا اور کوئی [illegible]
نہ ہوتی تو غضب ہو جاتا۔ حُرؑ نے بشریت کی لاج رکھ لی۔ اہلِ معرفت یہ کہتے
ہیں کہ اگر کسی نبی یا امام کی پکار پر ایک آواز بھی اس کی تصدیق یا تائید میں نہ
اٹھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی غیرت اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ معاشرہ
قائم رہے۔ کبھی کبھی ایک آدمی کا کھڑا ہو جانا اور حق کی دعوت پر لبیک کہنا
عذابِ الٰہی اور معاشرہ کے درمیان دیوار کا کام دے جاتا ہے۔ اور معاشرہ
کو بچالے جانے میں معاون ہوتا ہے۔ کسی جگہ اگر تم کو ابوذر دنیا سے
خفا نظر آئے یا کوئی یزید کی فوج کو چھوڑ کر حسینؑ کی طرف آتا نظر آئے تو اللہ
کا شکر کرنا یا بغداد کی گلیوں میں بہلول دیوانہ نظر آئے تو شکر کرنا کہ کہیں یہی
تو وہ ہستی نہیں ہے جو معاشرہ کو عذابِ الٰہی سے بچائے ہوئے ہے۔ اور
کلام پاک میں ہے کہ جب لوگوں نے رسول پاک کو ایذائیں پہنچائیں تو عذاب
الٰہی آجاتا مگر اس معاشرہ میں وہ بھی ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ سے
استغفار کرتے ہیں وہی کہ معاشرہ جن کی تحقیر کرتا ہے اور جن کو تکلیفیں دیتا ہے
وہی معاشرے کے بچانے والے ہوتے ہیں اور یہ صالحین کی پہچان ہے۔

شہید کے واسطے ہم کو دیکھنا ہوگا کہ وہ کس چیز کو ماننے والا ہے۔ محض
زبان سے ماننا نہیں بلکہ اس کی زندگی اس بات کی گواہی دے کہ وہ اس
چیز کا ماننے والا ہے اور وقت آنے پر اپنی جان دے کر بتائے کہ وہ اس
چیز کا واقعی ماننے والا ہے۔ ہم اس حقیقت کو ماننے والے ہیں جو اللہ تعالیٰ
نے اپنے رسول کے ذریعے دنیا میں بھیجی اور ہم اس حقیقت کو ماننے

والے ہیں جس کی نشانی حسینؑ ابنِ علیؑ ہیں۔ یہ گواہی اصل شہادت ہے اور حبیب ابنِ مظاہرؓ، مسلم ابنِ عوسجہ، زہیر قین۔ یہ صدیقین تھے۔ یہ صالحین تھے۔ یہ شہدا تھے اور یہ اپنے مولا حسینؑ کے ساتھ اس طرح مل گئے کہ ان کا ایک حصہ بن گئے۔

ساتویں مجلس

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس کی ذات حق ہے اور جس چیز کی اس سے نسبت ہے وہ حق ہے۔ اس کے علاوہ تمام چیزیں بے حقیقت ہیں۔ اس نے کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ رسول کو حق کے ساتھ نازل کیا۔ کتاب کو حق کے ساتھ اتارا۔ مرا لا حق ہے۔ اس کے وعدے حق ہیں۔ اس کے وعید حق ہیں۔

اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفےٰ پر جن کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ۔ نور کے ساتھ اور کتاب کے ساتھ نازل کیا۔ جس کے آنے سے باطل مٹ گیا اور باطل تو مٹنے والی ہی چیز ہے۔ وہ کہ جس نے دنیا کے سامنے حق و باطل کا امتیاز واضح کر دیا۔ جس حجت کے بعد اب یہ بندہ کے اختیار کی بات ہے جو چاہے حق کا راستہ اختیار کرے اور جو چاہے باطل کا راستہ اختیار کرے۔

اور ہمارا اسلام ہو اس بندۂ خدا پر جس کے لئے اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا کہ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ وہ کہ جس کی ذریت اظہار حق و باطل کے مابین ایک فرقان بن گئی ایک امتیاز بن گئی۔

عزیزان گرامی اس سے قبل میں اپنی سمجھ کے مطابق امام حسنؑ کے اس ارشاد کی وضاحت کر چکا ہوں جو آپ نے اپنے کام اور اپنے رویہ کے متعلق لوگوں سے کیا۔ مختصراً میں نے یہ کہا تھا کہ اگر امام حسنؑ اس موقع پر امت کی رہنمائی نہ کرتے تو دین اسلام ظالموں کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہوتا اور

دینِ اسلام کی وہ روایت جو حکومتِ ظاہری سے وابستہ تھی۔ وہ سب اسلام کا ایک جزو بن گئی ہوتی اور اسلام بالکل ختم ہو جاتا۔ میں نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی تھی کہ امام حسنؑ کی صلح اور امام حسینؑ کے جہاد میں کتنا گہرا تعلق ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا انعقاد ناممکن تھا۔ یہ بات تو قدرت کے فیصلے میں طے ہو چکی تھی کہ دینِ اسلام کو بچانے اور اس کے اصول کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے ایک کربلا کی ضرورت ہے۔ وہ کربلا کس طرح ممکن ہوگی یہ جاننے تھوڑے سے غور کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ صلحِ حسن کے بغیر ناممکن تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ سب سے بڑا مسئلہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنے کا ہے۔ کیونکہ جس ڈھب پر ہماری دنیا چل رہی ہے اس میں حق و باطل بہت ملے جلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ضروری ہوتا ہے کہ حق کو باطل سے بالکل جدا کر دیا جائے۔ اور اس سلسلے میں صلحِ حسن ایک بہت اہم قدم تھا۔ اس صلح کے بعد اب ظلم کو ایک کھلا میدان مل گیا۔ حق و باطل جب علیحدہ ہو جاتے ہیں تو عوام کو راہ مل جاتی ہے کہ چاہے حق کی طرف جائے یا باطل کی طرف جائے۔ لیکن جب تک حق و باطل ملے جلے ہوتے ہیں تو انسان بھول بھلیوں میں ہوتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کس راستے پر جائے۔ جب یہ تفریق ظاہر ہو گئی تو ظلم بڑھتا چلا۔

اس سے قبل میں بیعت کے متعلق بتا چکا ہوں کہ ایک بیعت خلافت کی ہوتی ہے اور ایک اللہ اور اس کے رسول کی ہوتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ بیعت کا مفہوم بدلتا چلا جا رہا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے کیوں کہ سب کو معلوم ہے کہ کربلا کے واقعہ میں جو واحد معاملہ تھا وہ امام حسینؑ سے یزید کی بیعت طلب کرنے کا تھا۔ یزید مصر تھا حسینؑ سے بیعت لینے پر اور حسین مستقل مزاجی سے انکار کرتے رہے۔ یزید کیوں اصرار کر رہا تھا۔ اس کی وجہ

وہی تھی جس کی بنا پر امام حسین انکار کر رہے تھے ۔ یزید کا اصرار بھی شدید تھا حسین
کا انکار بھی اتنا ہی شدید تھا ۔ تو اب یہ سمجھنا ہے کہ بات کیا تھی جو ایک طرف
اتنا اصرار تھا اور دوسری طرف اتنا انکار تھا ۔ خلافت سے بیعت کے سلسلے میں اپنی
کسی گذشتہ تقریر میں بتا چکا ہوں کہ حضرت ابو بکر نے فرمایا تھا کہ "لوگو اگر میں
سیدھے راستے پر چلوں تو میرے ساتھ تعاون کرنا اور اگر میں غلط راستہ
پر چلوں تو مجھ کو سیدھا کر دینا سنبھال لینا" مگر شام میں جو حکومت قائم ہوئی تھی اس
کے متعلق تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ کس طرح اور کیا کیا سازشیں ہوئیں اور یہ طے
کر لیا گیا کہ امیر معاویہ کے بعد یزید کس طرح تخت نشین ہو جب کہ صلح حسن کی
ایک شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد خلافت امام حسنؑ یا امام حسینؑ کی طرف پلٹ
جائے گی بعض روایات میں یہ ہے کہ شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد مسلمان
جس کو چاہیں اپنا سردار اور خلیفہ بنا لیں ۔ بہر صورت یہ ہرگز نہیں تھا اور
اس کی خاص طور سے بندش تھی کہ امیر معاویہ کے بعد ان کا بیٹا یزید
تختِ خلافت پر متمکن ہوگا ۔ اس کے لئے ایک باقاعدہ سازش کی گئی ۔
لوگوں کو روپیہ بھی دیا گیا ۔ شام میں تو لوگ یزید کی بیعت کرنے کے لئے
تیار تھے اور ہر بات اور ہر امر پر بیعت کر سکتے تھے ۔ لیکن مدینہ کی طرف
سے معاویہ کے دل میں خلش تھی ۔ کیوں کہ وہاں چند بزرگ صحابی موجود تھے ۔
اور بہت سے بزرگ صحابیوں کی اولاد بھی موجود تھی ۔ مثلاً عبدالرحمٰن ابن ابو بکر ،
عبداللہ ابن عمر ، عبداللہ ابن زبیر ، حسین ابن علی موجود تھے ۔ یہ لوگ وہ ہیں جو
رسول اللہ کے اکابر صحابہ میں شمار ہوتے تھے ۔ معاشرہ میں ان کی حیثیت تھی ۔
اب ظلم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ظالم کی نفسیات یہ ہے کہ جتنا زیادہ ظلم
کرتا جاتا ہے اتنی ہی کمزوری محسوس کرتا جاتا ہے کیوں کہ ظلم کا خاتمہ بالآخر تباہی پر

ہوتا ہے۔ ظلم کو جب بڑھتے ہوئے دیکھو تو یہ سمجھ لو کہ جیسے صبح ہونے سے قبل رات کی سیاہی اور ظلمت ہوتی ہے۔ اور یہ بات ظالم کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ ظلم کی ایک حد ہوتی ہے اور اس حد کے بعد اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے جو بھی قدم اٹھایا جاتا ہے وہ خلاف پڑتا ہے۔ اب کوشش اس بات کی ہے کہ لوگوں سے یہ منوایا جائے کہ جو کچھ بھی ہوا ٹھیک ہوا۔ یہ تمام دنیاداری کا کھیل ہے اور کوشش یہ ہے کہ دین کی ایک نشانی جو موجود ہے دین کا ایک امام جو موجود ہے تو وہ بھی اپنی پسندیدگی کی مہر اس پر ثبت کر دے گویا اب آئندہ دین کا کام یہ رہ گیا کہ یہ دنیا کے نفس پرست حکمراں، یہ دنیا کے حاکم جو بھی کرتے ہیں دین کا نمائندہ اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے کہ بیشک جو ہوا ٹھیک ہوا۔ اور اب بیعت کے معنی یہ ہیں کہ دین دنیا سے مغلوب ہو جائے اب اس کا کام یہ نہیں رہا کہ لوگوں کی ہدایت کرے۔ یہ بتایا جائے کہ حق کیا ہے۔ باطل کیا ہے۔ یعنی اب کوئی احتجاج کا موقع باقی نہیں رہا۔ اب دین کے سپرد یہ کام ہے کہ دنیاوی حاکم جو بھی کریں حاملانِ دین اس کی توثیق کرتے چلے جائیں اور اس کے عوض انعامات، جاگیریں، اعزازات اور جو کچھ انھیں دنیا سے مل سکتا ہے سب ملے۔ ایسے واقعات اسلامی تاریخ میں بہت ملیں گے جس میں دنیا پرست علمائے دین حاکموں کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور ان کا کام یہ رہا کہ جو کچھ حاکمانِ وقت نے کرنا چاہا، یہ آیتوں کو توڑ مروڑ کر کسی نہ کسی طرح دین میں اس کا جواز پیدا کر دیں۔ اگر آپ خاندانِ بنو عباس کی تاریخ دیکھیں کہ عالمانِ دین سے کیا سوالات کیے گئے ہیں اور ان کا جواز پیدا کرنے کو کہا گیا ہے اور کس طرح جواز پیدا کیا گیا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی اپنا سر پیٹے یا روئے کہ دین کے ساتھ یہ کیا مذاق ہو رہا ہے۔ لیکن ایسی روایت بھی تو

قائم ہو کہ ہر زمانے میں اللہ کا کوئی نہ کوئی بندہ کھڑے ہو کر سلطانِ جابر کے سامنے یہ
کہہ سکے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو وہ طاقت کے نشے میں کر رہے ہو ورنہ حقیقت
یہ ہے اور حق یہ ہے۔ تو اس روایت کے قائم ہونے کی بھی تدبیر اللہ کر رہا
ہے۔ تو اب ذہن میں یہ بات رکھیں کہ بیعت کے معنی صلح کے نہیں ہیں جیسا کہ عبید اللہ
ابن زیاد نے جو یزید کی جانب سے کوفہ کا گورنر تھا عمر ابنِ سعد کو لکھا تھا کہ تم
کو صلح کرنے کے لئے نہیں بھیجا ہے۔ بیعت لینے کے لئے بھیجا ہے۔ حسینؑ سے
بیعت لو۔ ورنہ حسینؑ تو کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنی حجت تمام کر دی تم
نے مجھے بلایا۔ میں آ گیا۔ اگر تم کو میری ہدایت نہیں چاہئے تو میں مدینہ واپس
جاتا ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے یہ پیش کش کی تھی کہ میں اسلامی
مملکت کے حدود کے باہر چلا جاتا ہوں جس میں ہندوستان کا نام بھی ہے
آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مجھ کو یقین ہے کہ غیر ملک والے میری تم سے
بہتر مہمان نوازی کریں گے۔ مگر حسینؑ کی کوئی بات نہ مانی گئی بلکہ شرط یہ ٹھہری
کہ جو کچھ امیر معاویہ نے کیا۔ جس طرح یزید تخت پر آیا اور جو کچھ یزید کر رہا
ہے سب کو درست مان لیں اور امام حسینؑ نے تمام کثیر فوج کے سامنے
اپنے خطبہ میں فرمایا "لوگو! میں نے اپنے جدِ بزرگوار سے سنا ہے کہ جو شخص
ایسے بادشاہ کو دیکھے، ایسے سلطان کو دیکھے جو جبر اور ظلم سے لوگوں پر حکومت
کر رہا ہے۔ لوگ اس کو نہیں چاہتے اور وہ زبردستی ان کے سروں پر
سوار ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ سے بندوں کا عہد توڑ دیا ہو۔ سنتِ
نبوی کو ختم کر دیا ہو۔ جس نے حلالِ خدا کو حرام اور حرامِ خدا کو حلال بنا دیا
ہو۔ جہاں کوئی قاعدہ کوئی قانون نہ ہو۔ جو کچھ حاکم کی مرضی ہو وہی صحیح ہو۔
جس نے لوگوں کی دولت کو اپنا ذاتی مال سمجھا ہو۔ خراجِ سلطنت کو اپنی

ذاتی ملکیت سمجھا ہو اور اسے اپنے تعیش پر خرچ کرے یا ان لوگوں پر جن سے اس کو اپنی مدد اور تائید کی ضرورت ہو یعنی جو اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے لوگوں کو رشوت دے تو ایسے حاکم کو دیکھ کر نہ زبان سے احتجاج کرے اور نہ اس کے خلاف کوئی عمل کرے تو اللہ تعالیٰ کو یہ حق ہے کہ جو ٹھکانا اس ظالم کا ہے وہ اس کا بھی کر دے جس نے یہ سب دیکھ کر احتجاج بھی نہیں کیا۔ یہ حضورؐ سرورِ کائنات کی حدیث ہے جو امام حسینؑ بیان کر رہے ہیں۔ اور ان خراب حالات میں یزید کا حسینؑ سے اصرار ہے کہ بیعت کرو۔ مہر تصدیق ثبت کرو۔

جب ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بیعت کرنے میں کیا وعدہ شامل تھے تو ہم جان لیتے ہیں کہ یقینی طور پر کہ امام حسینؑ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ یزید کی بیعت کرتے یہ تو گویا یوں ہوتا کہ جیسے دین کا امام کہہ رہا ہو کہ اب دین کا کام اور دین کا وظیفہ یہ ہو گیا کہ سلطانِ جابر جو کچھ بھی کرتے رہیں اس کی تائید ہوتی چلی جائے۔ اب ظلم اپنی تمام تر بھیانک صورتوں میں نمایاں ہو گیا اور امام حسینؑ نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں یعنی ان بہتر آدمیوں کو لے کر جن میں انبیاء کو ملنے کی۔ صدیقیت کی۔ صالحیت کی اور شہادت کی صفات تھیں۔ یہ بتایا کہ جب معاملہ حق و باطل ہی کا ہے تو پھر باطل کتنی ہی طاقتیں جمع کر لے اور کتنی ہی فوجیں جمع کر لے اور حق تعداد میں کتنا ہی کم ہو مگر خالص ہو کوئی آمیزش نہ ہو تو پھر حق کا مقصد پورا ہو کر رہے گا۔ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ اور بے شک باطل مٹنے والا ہے۔

حق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ باطل کو باطل ظاہر کر کے چھوڑتا ہے۔ مثلاً فرض کرتا ہوں کہ ابوجہل اپنے قبیلے کا بہت بڑا سمجھدار اور قبیلہ کا بہت

بڑا پاسبان اور بہت بڑا مشیر سمجھا جاتا تھا۔ وہ گویا قریش کی طاقت کا قلعہ تھا۔ لوگ اپنے جھگڑے لے کر اس کے پاس جاتے تھے اور وہ فیصلہ کرتا تھا۔ وہ ابو حکم تھا۔ ابوجہل نہ تھا۔ حضورؐ رسول مقبول کے ظہور کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے صحیح رنگ ابوجہل میں ظاہر ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا نام قبیلوں کی دلتانو میں بڑی عزت سے چلتا رہتا۔ اسی طرح دنیا میں بڑے ظالم آدمی ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے عیش پرست گزرے ہیں۔ اگر کربلا کا واقعہ نہ ہوتا تو یزید بھی تاریخ میں اسی طرح گزر جاتا جیسے اور بہت سے جابر۔ غاصب اور ظالم حکمراں تاریخ میں ملتے ہیں۔ ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنھوں نے بھائیوں کو قتل کر کے تخت حاصل کیا۔ ایسے جابر بھی گزرے ہیں جن کے متعلق تاریخ لکھتی ہے کہ ان کے زمانے میں بڑا استحکام تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر کربلا کا واقعہ نہ ہوتا تو یزید کے لیے لکھا جاتا کہ اچھا شاعر تھا شعر کا مذاق رکھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ حسینؑ کا دم تھا جس نے یزید کو یزید بنا دیا۔

عزیزو! یہ نہ سمجھو کہ یزید کوئی غیر معمولی ہستی ہے۔ یا وہ دنیا بھر سے زیادہ برا آدمی تھا۔ اور اس لئے امام حسینؑ نے یہ سب کچھ کیا۔ اور اگر اب پھر کوئی ایسا برا آدمی آئے تو ہم بھی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر آج ہماری خوش قسمتی سے حسینؑ یا ان کے نائب تشریف لے آئیں تو پھر دیکھئے گا کہ کون کون اور کتنے یزید ہیں اور ان لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ "یا لیتنی کنا معکم فنفوز فوزاً عظیماً" ان میں کتنے ایسے ہیں جو ٹال رہے ہیں اور حسینؑ کے یا ان کے نائب کا ساتھ دینے سے بھاگ رہے ہیں۔ اس لئے کہ حق کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے اور اس کا تقاضا بہت سخت ہوتا ہے صدیوں کی غفلتوں کو جگانا ہوتا ہے۔ جھنجوڑنا ہوتا ہے اور

اس کے لیے زندگی کی کشمکش میں پھنسا پڑتا ہے اور اس کے لیے مردہ روحیں تیار نہیں ہوا کرتیں۔ مرد حق معیار ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کرتا ہے کہ حق کس کو کہتے ہیں اور باطل کس کو کہتے ہیں۔ جناب رسول خداؐ نے فرمایا کہ علیؑ حق کے ساتھ ہے اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ پہلی بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جو کچھ حق ہوتا ہے وہ علیؑ کرتا ہے۔ علیؑ کی ہر بات گفتار، کردار، خاموشی، اقدام یہ سب حق ہیں۔ یعنی ایک انھوں نے ایک معیار بنالیا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیا ہے۔ مگر دوسرا حصہ یعنی حق علیؑ کے ساتھ ہے ذرا گہری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علیؑ کا اور حق کا ساتھ اتنا زیادہ گہرا ہے کہ اب علیؑ کا خمیر اور ان کی ہستی حق کے اندر ڈھل چکی ہے اور علیؑ حق کا مجسمہ بن گئے ہیں۔ اب اس منزل پر حق کی تعریف یہ ہے کہ جو علیؑ کریں وہ حق ہے۔ جس سے علیؑ منع کریں وہ حق نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اب یہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بات جو علیؑ نے کی وہ حق تھی کہ نہیں۔ اگر حق کو تلاش کرنا ہے تو یہ دیکھو کہ علیؑ نے کیا کیا۔ جس وقت یہ حق موجود ہوتا ہے۔ اور یہ حق اقدام کرتا ہے تو حق و باطل نمایاں طور پر الگ ہو جاتے ہیں۔ ابوجہل ابوجہل بن جاتا ہے۔ اور یزید یزید بن جاتا ہے۔ اور جس وقت دنیا میں اس حق کا نمائندہ تشریف لائے گا تو اسی طرح حق حق ہو جائے گا۔ اور باطل باطل ہو جائے گا۔ سب سے مشکل کام یہی ہے کہ باہم خلط ملط ہوئے حق و باطل کو کس طرح علیحدہ کیا جائے تاکہ لوگوں کو اپنا راستہ معین کرنے میں دشواری نہ ہو۔ جس کا دل چاہے کفر اختیار کرے جس کا دل چاہے دین کو اپنائے تو اس طرح امام حسنؑ کی صلح کا سلسلہ جو چلتا ہے وہ یزید کی طلب بیعت اور امام حسینؑ کے انکار بیعت تک پہنچتا ہے۔

اس سے قبل قرآن پاک میں موسیٰ اور خضر کا جو واقعہ ہے وہ بیان کر چکا ہوں۔ اس سلسلہ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ پیغمبر ہیں اور حضرتِ خضر ان کو علم دے رہے ہیں جو موسیٰ نہیں جانتے۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ عالم دو ہیں اور اسی لیے علم بھی دو ہیں۔ ایک عالمِ تکوینی ہے یعنی World of Being اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اس امر کو چلا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کی دنیا ہے جس کا ہمیں یا تمہیں کوئی علم نہیں ایک ہے عالمِ تشریعی یعنی شرع سے۔ وہ دنیا کہ ایک Law کے ذریعے چل رہی ہے جس میں آئین دیا جاتا ہے۔ وہ دنیا کہ جس میں Rule of Law دیا جاتا ہے۔ جس میں ہم دیکھتے ہیں۔ انسانی معاملات ہوتے ہیں اور ان کے فیصلے ہوتے ہیں۔ تو ایک عالمِ تکوین ہے اور ایک عالمِ تشریعی۔ تکوین کون سے نکلا ہے جس سے کائنات ہے۔ وہ دین کی بنیاد ہے اسی کو دوسرے الفاظ میں کہا گیا ہے ایک عالمِ امر ہے اور ایک عالمِ خلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کو پیدا کیا ہے وہ عالم ہے۔ عالمِ امر بھی اسی کا عالم ہے۔ ولہ الخلق والامر، لیکن تمام احکام اور مشیتِ الٰہی جو چلتی ہے اس کا تعلق عالمِ امر سے ہے اور "یومنون بالغیب" غیب پر ایمان لانے کے معنی یہی ہیں کہ آپ یہ سمجھیں کہ یہ محسوس اور مشہود حقیقتیں ہی صرف نہیں ہیں کہ جن کو آپ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ یہ تمام کا تمام کارخانہ کسی ایسے کے حکم سے چل رہا ہے۔ جو تمہارے سامنے نہیں ہے غیب میں ہے۔ تم یہ سمجھو کہ یہ عالمِ خلق جو ہے وہ عالمِ امر کے تابع ہے۔ مشیتِ الٰہی کے تابع ہے اور دنیا میں جو ہو رہا ہے وہ کسی مشیت سے ہو رہا ہے کسی حکم یا امر سے چل رہا ہے جو تمہارے مشاہدے اور حواس سے ماورا ہے۔ یہ تقویٰ اور دین کی پہلی

منزل ہے۔ کیونکہ اگر یہ سمجھ لیا گیا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے بس یہی حقیقت ہے۔ تو پھر نہ خدا رہا نہ فرشتے رہے نہ نزولِ کتاب ہے۔ پھر تو آپ اطمینان سے تمام کی تمام حقیقت اسی میں سمجھ لیں اور وہ سب Sociology کی اور Political Science کی جو کتب میں ہے بس وہی حقیقت ہے کیونکہ اب آپ کے لئے مشہود اور محسوس دنیا کے علاوہ اور کوئی دنیا ہی نہ رہی۔

ابتدا یہ ہے کہ آپ مانیں کہ کسی کا امر چل رہا ہے۔ اور جو کچھ محسوس ہو رہا ہے اور دکھائی دے رہا ہے اس سے بلند ایک عالمِ امر ہے اور عالمِ امر کے سب تقاضے اس عالمِ خلق میں پورے ہو رہے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ماننا دین کی پہلی منزل ہے۔ اس طرح عالم بھی دو ہیں ہم کو عالمِ امر کا کوئی علم نہیں۔ یہ عالمِ خلق جو ہے اس میں ایک شرع چل رہی ہے۔ وہ کوئی بھی شرع ہو کیوں کہ بغیر قانون چلاتے ہوئے، بغیر کسی شرع کے انسانوں کی دنیا نہیں چل سکتی۔

اس وضاحت کے بعد اب پھر موسیٰ اور خضر کے قصہ کی طرف آیا۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر کے دل میں بہت تجسّس ہوتا ہے۔ راز Mystery کو معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اب قرآن میں ہے کہ خضر جہاں ملنے والے ہیں وہ وہ مقام ہے جہاں دو بحر ملتے ہیں۔ ان کی وضاحت یہ کی گئی ہے کہ ایک بحر سے مراد عالمِ خلق ہے اور دوسرے سے مراد عالمِ امر ہے۔ اور موسیٰ عالمِ امر کا بھید معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اب ذرا قصہ کی طرف غور کیجئے کہ وہ بھنی ہوئی مچھلی اس چٹان پر پہونچی تو اب وہ عالم ہے جس جگہ موت نہیں ہے۔ جس جگہ مرنے والے زندہ کئے جاتے ہیں وہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ تو اس مچھلی نے سمندر میں اپنا راستہ نکال لیا اور سننے کے ساتھ ہی

جناب موسیٰؑ نے اپنے ساتھی جناب یوشع سے کہا کہ ارے یہ تو وہی جگہ ہے جہاں ہم کو جانا ہے۔ حضرت خضر نے جو تین باتیں کیں یا ان میں سے دو کو اگر عالم خلق یا تشریعی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ظلم ہیں۔ لیکن جس وقت خضر ان باتوں کی تشریح عالم امر کے اعتبار سے کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے عین عدل تھا اور اس کی رحمت تھی۔ ہم کو اس واقعہ سے یہ سبق دیا گیا کہ ہماری نگاہ محدود ہے۔ اور ہم کو جو ظلم ہوتے نظر آ رہے ہیں اگر ان کو ہم اس علم کے ساتھ دیکھ سکتے جو الوالامر کا حصہ ہے تو ہم کو معلوم ہوتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عدل اور اس کی رحمت کار فرما ہے۔ کلام پاک میں اکثر مقامات پر جہاں ظالم قوموں کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ظالم قوموں کو ہم جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں اور اس کے بعد الحمد للہ رب العالمین کا فقرہ استعمال ہوا ہے یعنی اللہ کی تعریف ہو۔ ربوبیت کی یہی شان ہے کہ یہ موت اور زندگی کا سلسلہ چلتا ہے۔ چونکہ انسان کی نگاہ محدود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے لحاظ سے حکم لگاتا ہے کیوں کہ وہ مشیت ایزدی سے ناواقف ہوتا ہے۔ مشیت ایزدی اپنے بندوں کے لئے رحمان اور رحمانیت کا پیغام ہے۔ اگر کسی جگہ بستیاں تباہ ہوتی ہیں تو وہ بھی کسی نئی زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اگر آپ کہیں تخریب کا عمل دیکھتے ہیں تو وہ بھی کسی نئی تعمیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ عدل خداوندی کا اثبات اس طرح سے کیا گیا کہ تمہاری نگاہ عالم خلق سے آگے نہیں جاتی۔ اور ہم عالم امر سے واقف نہیں جب کوئی بات ہو جاتی ہے تب مشیت ایزدی کی تھوڑی سی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے ورنہ اس کی مشیت کو کون جانتا ہے۔

اگر یہ تینوں کام خضر کرنے والے نہ ہوتے جو علم رکھنے والے تھے تو درد کام صریحاً ظلم ہوتے۔ اور جناب موسیٰ کا اعتراض عالم تشریع یعنی عالم خلق کے لحاظ سے لازمی تھا اور صحیح تھا۔ لیکن عالم امر کی سطح پر خضر بالکل ٹھیک تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت شعور کی سطح بدلتی ہے تو احکام بھی بدل جاتے ہیں۔ جو چیز ایک سطح پر ظلم نظر آتی ہے وہی دوسری سطح پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو جو اپنے آگے ایک قدم سے زیادہ دیکھ نہیں سکتے۔ یہ بتایا جارہا ہے کہ مشیت ایزدی تک ہماری رسائی نہیں ہے تو جب آپ کو کوئی ایسی صورتیں نظر آئیں تو ان کو دیکھتے رہیے۔ مگر حکم مت لگائیے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مشیت ایزدی تو لا نہائی ہو کر رہتی ہے۔ اور سب سے بڑا معرفت کا مقام رضاً بقضا بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اپنی رضامندی۔ بظاہر یہ دونوں باتیں ایک ہی نظر آتی ہیں لیکن اس کا غلط انطباق بھی ہوتا ہے۔ یزید نے اپنی طاقت کے جواز میں یہی دلیل استعمال کی تھی کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے یا کر رہا ہے اس میں کوئی بہتری ہی ہوتی ہے۔ اسی لئے نہ کسی برا کرنے والے کو برا کہا جاسکتا ہے اور نہ کسی اچھا کرنے والے کو انعام دیا جاسکتا ہے۔ اگر یزید خلیفہ بن گیا تو اللہ نے اس کو خلیفہ بنایا اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ اس جگہ پر کیوں ہوتا۔ لہٰذا آپ کیوں احتجاج کرتے ہیں۔ یہ پورا فلسفہ بنی امیہ کی حکومت کو مضبوط کرنے اور اس کی تائید کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ مرجیہ یا جبریہ فرقے والے کہتے تھے کہ کسی آدمی کو جہنمی نہ کہو۔ کسی کو برا نہ کہو۔ تمھیں کیا معلوم اللہ تعالیٰ تو رحمٰن ہے ممکن ہے معاف کر دے۔ اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ برا کام کرنے والے کو معاف کر سکتا

ہے تو کیا برے کو برا کہنے والے کو معاف نہیں کر سکتا؟ دوسری بات یہ ہے
کہ جو کچھ ہو رہا ہے اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے اس کے ارادے سے
ہو رہا ہے تو پھر کس کو کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات ٹھیک ہو رہی ہے
یا غلط ہو رہی ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے اوپر جو فرض ہے اور
ہماری جو تکلیف ہے وہ ہمارے علم کے مطابق ہے۔ اسی عالم خلق کے
اندر اللہ تعالیٰ نے کچھ ذمہ داریاں ہم پر عائد کی ہیں ہم ان ذمہ داریوں
کے تحت کام کرتے ہیں اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہیں۔ مشیت کو
اس کا اختیار ہے۔ مگر اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اچھی بات کا نتیجہ اچھا ہی
ہوتا ہے۔ جیسے اچھے بیج کا درخت اچھا نکلتا ہے۔ اس وقت چاہے
ہم کو یہ نظر آئے کہ نیکی کی طاقتیں پسپا ہو رہی ہیں لیکن ہمیں اپنی کوششوں
کو نہیں چھوڑنا چاہیے سست نہیں پڑنا چاہیے۔ کیونکہ ہم پر تکلیف
یہی ہے اور ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ جس وقت دیکھیں تو برائی
کی مخالفت کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کریں اچھی باتوں
کی ترغیب دلائیں اور بری باتوں سے روکیں۔ تو ہم اپنی سی کوشش کیئے
جائیں۔ اگر ہماری یہ کوششیں بارور ہوتی نظر نہ آئیں تو ممکن ہے
کہ یہ ہماری نگاہ کا قصور ہو۔ کیوں کہ یہ بات اس سچا وعدہ کرنے والے
نے کہی ہے کہ اگر کوئی شخص پورے یقین کے ساتھ اللہ اور روز قیامت
آخرت پر ایمان رکھے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ اس کے اجر
اور اس کے جزا کو ضائع نہیں کرے گا۔ تو اب اس انقلاب آفریں
یقین کے ساتھ دونوں زاویوں کے فرق کو دیکھو۔ حالانکہ بظاہر
باتیں ایک سی نظر آتی ہیں۔ الفاظ ایک جیسے نظر آتے ہیں ایک زاویہ

نگاہ تو یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے تم واہ واہ کرتے رہو۔ اور یہ
کہتے رہو کہ This is the best of possible wands یعنی جتنی بھی
دنیائیں ہو سکتی ہیں ان میں یہ دنیا سب سے بہتر ہے۔ دوسرا زاویہ نگاہ
یہ ہے کہ یہ سمجھتے رہتے کہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ میرے اوپر کچھ ذمہ داریاں
ہیں۔ اگر دنیا میں برائیاں ہیں اور شر پھیلا ہوا ہے تو میری ذمہ داری تھی
کہ میں نے اس شر کو دور کرنے کے لئے اپنی حد تک کیوں کوشش نہیں
کی۔ میرا اس کام میں کیا حصہ contribution ہے۔ اگر میری کوششیں ناکام
بھی ہوئی ہیں تو کوئی بات نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ نیک کام کبھی
رائیگاں نہیں جاتا۔ کسی نہ کسی طرح اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میں
اسے دیکھوں یا نہ دیکھوں۔ خواہ اس دنیا میں ہو یا دوسری دنیا میں ہو۔
یہ "رضا بقضا ہیٔ" کے اصل معنی ہیں۔ ایک بات پر اتفاق کرتے ہوئے یعنی
مشیت ایزدی کا ہم کو علم نہیں ہے۔ دو راستے نکلتے ہیں ایک راستہ کفر
اور ظلم کی طرف لے جانے والا ہے اور دوسرا راستہ ظلم کے خلاف انسان
کے ہاتھ مضبوط کرنے والا ہے۔ کیوں کہ اس سے زیادہ بے جگری سے
کون اپنا کام کر سکتا ہے جو نتیجہ سے بے پرواہ ہو اور جب نتیجے کی بات
آئے تو کہے کہ الستی منی والاتمام من اللہ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرا کام ٹھیک
ہے اور میری کوششیں نیک ہیں تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق رائیگاں
نہیں جائیں گی۔ اس سے زیادہ انقلاب آفریں طاقت کس میں پیدا
ہو سکتی ہے کہ جو نتیجہ سے لاپرواہ ہو کر نیک عمل کرتا ہے۔ اور یہ عمل
اور یقین "رضا بقضا ہیٔ" کے فلسفہ سے نکلتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ خیال
رہے کہ مشیت اور چیز ہے اور رضائے الہی اور چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے اپنی مشیت قائم کرنے میں آپ کو دعوت نہیں دی ہے کہ آپ سے -cons ultation کرکے باہم مشورہ سے اس دنیا کو چلایا جائے۔مشیت میں ہمارا کوئی دخل نہیں اور نہ کہیں اللہ نے کہا ہے کہ اس کی مشیت میں ہمارا کوئی حصہ ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا گیا ہے کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کی رضا اور رضوان کو تلاش کرو۔ یعنی وہ باتیں کرو جو اس کی خوشنودی کا باعث بنیں۔ اور وہ باتیں اللہ نے بتا دیں اور تفصیل کے ساتھ بتا دیں کہ کن کن باتوں سے اللہ خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے اور پھر انسان کا ضمیر خود گواہی دیتا ہے کہ کون سے کام نیک ہیں اور کیا کام بد ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ہم نے نفس کو خلق کیا اور اس کو الہام کے ذریعے بتا دیا کہ سچی بات کون سی ہے اور جھوٹی بات کون سی ہے۔ ایک فرقان سینے کے اندر رکھ دیا۔ اب اگر کوئی یزید صفت آدمی یہ کہے کہ میں جو اس جگہ بیٹھا ہوا ہوں تو وہ اللہ کی مرضی ہے کیوں کہ اگر وہ نہ چاہتا تو میں اس جگہ پر نہ ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ برے لوگوں کو ڈھیل دیتا ہے۔ فرصت دیا کرتا ہے کیوں کہ اللہ کو اپنی طاقت کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں ہوتا۔ وہ چاہے فرعون ہو۔ یا معاویہ ہو۔ یا یزید ہو۔ اور کتنے ہی جابر اور طاقتور کیوں نہ ہوں۔ اس کی مملکت سے باہر نہیں ہو سکتا۔ جس مملکت کی سرحدیں اللہ کا علم، قدرت اور ارادہ ہے۔ ڈرتے تو وہ ہیں جن کی Authority یا اقتدار کمزور بنیادوں پر ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کے Absolute power ہونے کی نشانی ہے کہ اس نے کہا کہ اس انسان کو تو دیکھو کہ ہم نے اس کو کس طرح پیدا کیا ہے۔ اور اس کو اتنا اختیار دے دیا ہے کہ اگر چاہے تو ہمارا

کھلم کھلا دشمن سمجھا جائے اور سوچنے کی بات یہ ہے جس کسوٹی پر تمہارے اعمال پرکھے جائیں گے وہ یہ ہے کہ تم نے جو اعمال کئے ہیں وہ اللہ کی خوشنودی اور اس کی رضا کے لئے کئے ہیں یا وہ کئے ہیں جو اس کی ناراضگی کا باعث بنیں اور جن سے تم کو منع کیا گیا تھا۔ عام طور سے اللہ کی مشیت اور اس کی رضا کو Confuse کیا جاتا ہے۔

وہ لوگ کہ جن کو عالم امر سے بھی تعلق ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ امر دے دیتا ہے تو ان کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا۔ کیونکہ یہ سطحیں یا Level مختلف ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ابراہیم نے ایک مرتبہ تو یہ خواب دیکھا جس میں صالح بیٹے کی دعا مانگی۔ جب بیٹا ہوا۔ چلنے پھرنے دوڑنے لگا۔ کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا اور کعبہ کی تعمیر کے لئے گارا اور مٹی حضرت ابراہیم کو دیتا رہا۔ غرض یہ کہ جب وہ قوت بازو بن گیا تو ایک روز آپ نے اسی بیٹے سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ تم کو اللہ کی راہ میں قربان کر رہا ہوں۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ بیٹا یہ نہیں کہتا کہ بابا یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ آپ کو جو امر کیا گیا ہے جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ اگر کوئی دوسرا آدمی ایسی حرکت کرتا تو گناہ گار ہوتا۔ لیکن قرآن پاک میں ہے کہ جس وقت دونوں نے یہ بات تسلیم کر لی اور بیٹے کو زمین پر لٹا دیا گیا تو آواز آئی۔ ابراہیم تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ اور ان کو اجر دیا گیا۔ اور ہم اس طرح سے نیک کام کرنے والوں کو اجر دیتے ہیں اور پھر یہ بتایا گیا کہ ایک ذبح عظیم کو اس کا فدیہ بنایا گیا اور اس کو تمام عالم کے لئے تذکرہ بنا کر چھوڑ دیا گیا۔ انہی آیات میں دو جگہ ہے کہ ہم نیک کام کرنے والوں کو اجر

دینے والے ہیں۔ تو یہ بات عالم امر کی ہوا کرتی ہے ۔ اگر عالم تکوین والا کوئی شخص یہ کرے تو سب سے بڑا گناہ ہے۔ وہ اس لیے کہ ہر آدمی کا اپنا ایک منصب ہوتا ہے اور اپنے منصب سے بلند ہو کر کوئی بات کرنا تکبر کہلاتا ہے۔ اور یہ صفت شیطان کی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن جس وقت یہ بات عالم امر سے آتی ہے اور اس کے پاس آتی ہے جو عالم امر کے اشارے سمجھتا ہے اور اس موقع پر وہ اشارہ سمجھنے والے باپ بیٹے دونوں تھے۔ باپ تھوڑا سا اشارہ کرتا ہے اور بیٹا اشارہ سمجھ کر فوری یہ کہتا ہے کہ آپ وہ کریں جس کا آپ کو امر کیا گیا ہے۔ اس طرح جب اللہ کے اس بندے کا ذکر ہو جو اولوالامر ہے اور امر کے درجہ پر پہونچا ہے جب اس کی بات پر غور کیا کرو تو معرفت حاصل کیا کرو۔ اس پر اپنا فیصلہ صادر نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ تمہارا حکم تھوڑی دور تک جاتا ہے۔ اس کے رتبہ کو دیکھ کر اگر معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرو گے۔ تو انشاءاللہ معرفت حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ امام حسنؑ نے جو معاویہ سے صلح کی اس کے متعلق آپ نے بھی فرمایا کہ میں نے وہ کیا جو اللہ کے امر سے کیا اور جس وقت آپ حضرت خضر کا حوالہ دے رہے تھے تو کہا تھا کہ خضر نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے امر سے کیا۔

امام حسینؑ کا یہ مقام ہے اور یہ رتبہ ہے کہ تھوڑے سے آدمی لے کر یزید کے لشکر کا مقابلہ کریں۔ کورکورانہ مرو در کربلا۔ تا نہ رفتی چوں حسین اندر بلا دیکھنا جب تک اس منزل پر نہ ہو کہ حسینؑ کی طرح تمہارا امتحان لیا جاتا ہو تو تم یہ نہ کرنا کہ اندھے ہو کر تم بھی کربلا کے اندر چلے جاؤ۔ کربلا بنانے کا منصب ہر آدمی کا نہیں ہوتا۔ یہ ہر آدمی کا منصب نہیں ہوتا کہ مٹھی بھر آدمیوں کو لے کر حکومت کو چیلنج کرے یہ اس آدمی کا کام ہوتا ہے جو جانتا ہے کہ اس وقت

مشیتِ ایزدی کیا ہے۔ اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ گھر لٹتا چلا جاتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ میں اللہ کی قضا پر راضی ہوں۔ پھر اس کی شان یہ ہے کہ اس کا بیٹا جو امام ہے۔ جب وہ رات جلے ہوئے خیموں میں گزاری تو حمد اللہ اور شکر الحمد کہہ کر گزاری۔ اللہ جانے وہ کس بات کا شکر ادا کر رہے تھے۔ اور کن نعمتوں کا شکر ہو رہا ہے جو امام زین العابدینؑ نے ایک سجدہ میں تمام رات گزار دی۔ یہ مرتبہ اور مقام اولالامر کا ہوتا ہے۔ یہ اس کا مقام ہوتا ہے جس کا تعلق عالمِ امر سے ہوتا ہے۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ اسی طرح رسول اکرم محمد مصطفیٰؐ اپنے فرزندوں حسنؑ اور حسینؑ کے لئے جانتے تھے اور تیار تھے کہ ان کی قربانیاں یوں پیش کی جائیں۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے ساتھی۔ اپنے بیٹے اور اپنے سب عزیز و اقربا کی قربانی دی۔ اور اس شان سے دی جو فدیناہ بذبح عظیم کا مقصد تھا۔

عزیز و طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی ہر بڑی نعمت کے لئے کچھ صدقہ دیا جاتا ہے کچھ قربانی دی جاتی ہے۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ ملت اور یہ انسان جس پر یہ کرم کیا گیا ہے اس کا ظرف اس کرم کے قابل ہے کہ نہیں۔ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں انسانیت پر بہت بڑا کرم ہے گویا انسانیت کو ایک مرکز دیا گیا۔ اس کا امتحان لیا جا رہا ہے کہ بے شک وہ ہاتھ کعبہ کی تعمیر کے لائق ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں اپنے بیٹے کی قربانی دینے سے کبھی نہیں رکتے اور جس وقت کعبہ کی بنیادیں متزلزل ہوتی ہیں اس وقت بھی قربانی دی جاتی ہے تاکہ کعبہ کی بنیاد مضبوط کر دی جائے۔ یہ جو فاطمہ زہراؑ کا گھر لٹا ہے تو خانہ کعبہ کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے لٹا ہے۔

جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربان کرنے لے گئے تھے۔ اس طرح کربلا میں امام حسینؑ نے اپنے جوان سال فرزند حضرت علی اکبر کو قربان کر دیا۔ حضرت علی اکبرؑ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ آپ محمد مصطفیٰ سے مشابہ ترین شخصیت تھے۔ عزیزو میں تو یہ کہوں گا کہ محمد مصطفیٰؐ کی صورت تو ان کی سیرت کا آئینہ تھی۔ اور جب تک سیرت ویسی نہ ہو صورت مشابہ نہیں ہو سکتی اب جب کہ علی اکبر حضورؐ سے اتنے مشابہ تھے تو پھر سیرت میں بھی مشابہت تھی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک روشن نشانی تھی۔ جس طرح امام حسینؑ اپنے آپ کو پہچنوانا چاہتے تھے۔ اسی طرح علی اکبر سے کہا کہ بیٹا اذان دو۔ غالباً وہ صوتِ محمدی کو سنوانا چاہتے تھے اور جب ان کو جنگ کے لیے بھیجا تو فرمایا کہ یا اللہ میں اب تیری راہ میں شہید ہونے کے لئے اس کو بھیج رہا ہوں جو تیرے نبی سے صورت اور سیرت میں سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ اور جس وقت اپنے جدِ بزرگوار کو دیکھنے کو میرا جی چاہتا تھا تو میں اس کی شکل دیکھ لیا کرتا تھا۔

آٹھویں مجلس

تمام حمد اس کے لئے ہے جو انسان کو عدم سے وجود میں لایا۔ جس نے اس کو علم دیا قدرت دی اور ارادہ دیا۔ وجود، قدرت، علم، ارادہ یہ سب صفات اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ اور یہ وہ محاسن اور صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال رحمت سے ہم کو عطا کیں۔

اور میں درود بھیجتا ہوں محمدؐ مصطفےٰ پر جن پر اللہ نے قرآن نازل کیا۔ جس قرآن سے زندگی کے ایک طریقے۔ ایک سنت کو رواج ملا وہ ذاتِ گرامی جس نے اپنی سنت کو قائم کیا اور یہ وہ سنتِ محمدی ہے جس کا منبع اور مخرج خود اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اور میں سلام بھیجتا ہوں آئمہ اطہارؑ پر جنھوں نے زمانے کے انقلابات اور بدلتے حالات میں سنتِ محمدی کو قائم رکھا۔ اللہ ہم کو سنتِ محمدی کو سمجھنے اور اس پر زندہ رہنے کی توفیق دے۔

سرکارِ دو عالم رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد اولیٰ یہ تھا کہ دنیا کو علم و حکمت کی تعلیم دی جائے۔ اور تزکیۂ نفس کیا جائے۔ وہ بلندیاں جو انسانی نفس میں رکھی گئی ہیں وہ ظاہر ہوں۔ انسان کی ممکنات ظاہر ہوں اور اس کی Potent-ialities۔ بروئے کار آئیں انسان اپنے بلند ترین مرتبہ پر پہونچ جائے اور اس کا تعلق جو اللہ سے کٹ چکا ہے۔ وہ دوبارہ قائم ہو جائے۔ کلامِ پاک میں ہے کہ انھی میں سے ایک رسول مبعوث کیا گیا جو آیات کی تلاوت کرتا ہے۔

لوگوں کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور جو کتاب و حکمت کی بات کرتا ہے۔ ہر تعلیم کے طریقہ کے جانچنے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ معلم کیا ہے اس لئے کہ تمام تعلیم کا انحصار اس معلم پر ہے۔ پھر دیکھو کہ وہ تعلیم کیا ہے۔ وہ کتاب کیا ہے۔ معلم اور کتاب۔ کتاب اور معلم یہ ہر دین کا لازمی جزو ہے۔ پھر یہ دیکھو کہ اس تعلیم سے معاشرہ پر کیا اثر پڑا اور اس کے بہترین طالب علم کیسے بنے۔ یہ چار معیار ہیں کسی تعلیم کی حقیقت کے جاننے کے۔ یعنی معلم کیا ہے۔ تعلیم کیا دی جا رہی ہے اس تعلیم کا معاشرہ پر کیا اثر ہوا۔ اور اس academy کے scholars کیسے ہیں آیئے دیکھیں کہ ان چار معیاروں کا اطلاق دینِ اسلام پر کیسے ہوتا ہے۔ دینِ اسلام کے معنی ہی علم حاصل کرنا اور علم سکھانا ہے اور جناب رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے کہ زندگی میں دو ہی تو عمل ہیں۔ جو بامعنی ہیں۔ علم حاصل کرنا اور علم دینا سیکھنا اور سکھانا۔ انسان ساری عمر سیکھتا چلا جائے اور جو کچھ جانتا ہے وہ دوسروں کو سکھاتا چلا جائے۔

اب دیکھیے کہ اس دین کا معلم ہے محمدؐ مصطفےٰ۔ اس معلم کی کتاب ہے قرآن حکیم۔ اور اس کی تعلیم کا معاشرہ پر اثر دیکھنا ہے تو اس کے لئے اگر قبل اسلام دورِ جاہلیت سے موازنہ کیا جائے یا اس زمانے سے جب اسلام کی ابتدا ہوتی ہے اور جب اسلام نافذ ہونا شروع ہوا ہے۔ اور صرف عرب تک ہی اس کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ تمام دنیا کو نظر میں رکھا جائے تو فرق واضح ہو جاتا ہے کہ انسانیت پر انسانی معاشرہ پر دینِ اسلام کا کتنا زبردست مثبت اثر ہوا ہے اور اس اکاڈمی کا سب سے بڑا طالب علم ہے علیؑ ابن ابی طالبؑ ایسا سکھانے والا نہ دنیا نے دیکھا نہ ایسا سیکھنے والا۔ خود جناب امیرؑ اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ میں جب بچہ تھا تو اپنے بھائی کے پیچھے پیچھے ایسے چلتا تھا۔ جیسے ایک اونٹنی کا

بچہ اپنی ماں کے پیچھے چلتا ہے۔ اور رسول اللہؐ نے مجھے علم یوں عطا کیا ہے جیسے ایک کبوتر اپنے بچہ کو دانا بھراتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور اسوۂ حسنہ کی تربیت کی اس سے بہتر مثال اور نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علم کو سیکھنے کا معیار یہ ہے کہ استاد اپنے باصلاحیت شاگرد کو اپنی برابر بنائے۔ اسی طرح جس طرح اونٹنی اپنے بچہ کو ٹریننگ کرکے اپنا ایسا بنا لیتی ہے۔ گویا ایک روایت قائم رہتی ہے۔ فرض کرو کہ معلم بہت عظیم ہے لیکن اس کے بعد اس کے علم کی وہ روایت نہیں چلتی کیونکہ کوئی ایسا نہیں جس کو وہ معلم تعلیم دے کر اپنا جیسا بنا جائے تو اس طریقہ تعلیم میں نقص رہ جاتا ہے۔ تو گویا استاد کا کمال اور شاگرد کا کمال ... ہے کہ علم کی روایت نقل کی روایت جاری رہے۔ اور اس اکیڈمی کا کمال یہ ہے کہ ان میں سے ایسے شاگرد نکلیں کہ دیکھنے والے استاد اور شاگرد کے علم و نقل میں فرق محسوس نہ کر پائیں۔ اور باصلاحیت شاگرد میں وہی خصوصیت پیدا ہو جائے اور اس میں اور اس کے معلم میں کوئی فرق نظر نہ آئے۔

جس وقت آنحضرتؐ دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ میں تمہارے لئے دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک قرآن اور ایک میری عترت۔ کتاب اور حامل کتاب۔ اگر کتاب کو سمجھنا ہے تو ان سے سمجھنا۔ اور اگر ان کی سیرت سمجھنا چاہو تو قرآن کی روشنی میں دیکھنا۔ اور پھر فرمایا کہ یہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ دونوں میرے پاس حوض کوثر پر پہنچیں۔ بعض روایات میں ہے کہ میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک کتاب اور دوسرے سنّت۔ اب ذرا سنّت کے لفظ پر غور کیجیے سنّت کہتے ہیں رہنے کے طریقے کو۔ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ زندگی کا طریقہ کیا ہے کن چیزوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی پسند کیا ہے اور ناپسند کیا

ہے۔ یہ تمام کی تمام چیزیں مل کر سنت ہوتی ہیں۔ سنت کے معنی محض حدیث
کے نہیں۔ اور سنت کے معنی اسوہ اور سیرت کے بھی نہیں ہوتے۔ حالانکہ سنت
پر حدیث اور اسوہ کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ لیکن سنت ایک بالکل مختلف
concept ہے سیرت اور اسوہ سے۔ حدیث وہ ہے جو حضورؐ نے فرمایا۔
جس بات کا حکم دیا یا جس بات کو منع کیا۔ جس بات پر پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور
اسوہ کے معنی ہیں حضورؐ کے رہنے کا طریقہ، آپ کی سیرت، وہ باتیں جن سے
معاشرہ پر اثر ہوا۔ اور معاشرہ میں تبدیلی آئی۔ وہ ہے سنتِ محمدی۔ اور سنتِ
محمدی اور سنتِ جاہلیہ میں تضاد ہے۔ یعنی حضورؐ سے قبل عہدِ جاہلیہ کے معاشرہ
میں جو لوگ رہتے تھے۔ ان کا طریقہ اور تھا۔ ان کی زندگی کے معیار اور مقاصد
اور تھے۔ یعنی ان لوگوں کو چونکہ اس دنیا کے بعد کی زندگی کا علم نہ تھا لہذا
ان کے مقاصد یہ تھے کہ اس دنیا میں جتنی بہادری، جتنی شان و شوکت سے
ساتھ رہ سکو رہو۔ جاہلیہ کا صحیح ترجمہ Ignorance نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی
جہالت کو عربی میں تعرّف کہتے ہیں۔ Rash. Reckas یعنی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے
دے۔ وہ آدمی جس کی کیفیت ایسی ہو جیسے ہانڈی میں ابال آتا ہو۔ جس
کے جذبات میں جوش ہو۔ ذرا سی بات پر تلوار نکال لے اور لڑنا شروع کر دے
اور ایسی لڑائی جو نسلاً بعد نسلاً چلے۔ اپنے جذبات کا غلام ہو۔ حمیتِ جاہلیہ۔

اس کے بجائے حضورؐ نے جس سنت کو رائج کیا۔ وہ تقویٰ کی سنت
ہے۔ اب آدمی آدمی کی سرفرازی کا معیار بدل گیا۔ اب شجاعت کے معنی
بدل گئے۔ زندگی کے مقاصد بدل گئے رہنے کا طریقہ بدل گیا۔ اور یہ زندگی
کا طریقہ سنتِ محمدی کہلاتا ہے۔ سنت کے معنی ہیں Tradition یعنی
روایت۔ اور روایت اس وقت ہوتی ہے جب وہ نسلوں میں چلے۔ جب

تک نسلوں میں نہیں چلتی روایت نہیں بنتی۔ ایک نسل تک محدود رہنے والی چیز روایت نہیں بنتی۔

اب اس حدیث کی طرف آیئے۔ بیشتر اس کے کہ عترت اور سنت پر گفتگو ہو ذرا حدیث کے تیور پر بھی غور کرلیں۔ حضورؐ نے فرمایا اور یہ دونوں جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر پہونچے۔ اگر سنّت کے معنی حضور کے رہنے کا طریقہ تھا تو حضورؐ دنیا سے پردہ فرما رہے ہیں۔ تو کہنا یہ چاہیے تھا کہ قرآن اور میری سنّت دونوں ایک ہیں۔ بجائے اس کے کہ یہ کبھی الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر پہونچیں۔ غرض یہ کہ یہ حدیث جس طریقے سے بھی آئی ہو اتنی بات بالکل واضح ہے کہ یہ کوئی روایت ہے یہ کوئی آگے بڑھنے والی زندگی کی Tradition ہے جس کی طرف اشارہ ہے اور پھر آپ حدیث کے اس version کو دیکھیں جس میں قرآن اور عترت کا ذکر ہے تو پھر مطلب واضح ہو جاتا ہے۔ یا تو آپ یہ مانیں کہ حضورؐ کے بعد جتنے بھی زمانے آئے سب میں زندگی کی وہی قدریں رہیں جو حضورؐ کے زمانہ میں تھیں اور زندگی کے وہی طریقے رہے اور زندگی کی وہی پسند اور ناپسند رہی مگر ظاہر ہے کہ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ سنّت محمدی کس طرح سے قائم ہوئی ہے اور کسی ایک نسل میں قائم ہوتی ہے اور اس کو دیکھنا چاہو تو حدیث کے ان الفاظ کو دیکھو کہ "دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے عترت" تو اس سے پتہ چلا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم قرآن و سنت کا پیچھا نہ چھوڑنا۔ اور اگر تم میری سنّت کو دیکھنا چاہو کہ کہاں ہے اللہ کہاں وہ Tradition جاری ہے تو میری عترت میں دیکھنا۔ اس لئے

کہ یہ سنّت پر چلنے والے ہیں اور یہ قرآن سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔ یعنی ان کے رہنے کا طریقہ۔ ان کی زندگی کا نہج، ان کی زندگی کا مقصد وہی ہے جو قرآن سے ماخوذ ہے جس طرح میری زندگی کا نہج اور میری زندگی کے مقاصد قرآن سے ماخوذ تھے۔ تو اس طرح قرآن اور سنّت اور قرآن اور عترت علیحدہ نہیں ہوتے۔ یہ حضور نے مسلمانوں کو وصیت کی کہ یہ دو چیزیں ہیں رہبری اور ہدایات کے لئے۔

رسولِ خدا کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بہت دنوں بعد یعنی ۶۱ ھ میں ایک واقعہ کا تصور کر و کہ دمشق کی جامع مسجد میں یزید موجود ہے اور شہر کے تمام معززین اور ... موجود ہیں۔ کافی مجمع ہے۔ اور دربار میں ایک اور شخص رسن بستہ سیاسی قیدی کی حیثیت سے موجود ہے۔ اس کا نام ہے علیؑ ابن حسینؑ ۔ زین العابدینؑ۔ اب اس مجمع سے یہ آواز آتی ہے کہ ہم نے بنی ہاشم کی خطابت کا بہت چرچا سنا ہے۔ خلیفہ اس قیدی کو موقع دو کہ منبر پر جاکر خطاب کرے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ایسی حالت میں امام زین العابدینؑ بھلا کیا خطاب کریں گے۔ آپ سے کہا کہ منبر پر جاکر خطاب کیجئے۔ اس خطبہ کی تفصیلات میں جانے کے بجائے چند باتیں عرض کرنا مقصود ہیں۔ پہلے تو آپ نے اپنا تعارف کرایا کہ میں کون ہوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بلائے احسن میں مبتلا کیا۔ بلا کہتے ہیں امتحان کو۔ اسی سے ابتلا ہے یعنی وہ امتحان جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں سے لیتا ہے۔ وہ امتحان جس کا ہر کس و ناکس اہل نہیں ہوتا۔ ایسی مصیبتیں بھی ہوتی ہیں جو عذابِ الٰہی کے طور پر نازل ہوتی ہیں۔ اور ایسی مصیبتیں بھی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ بطور امتحان نازل کرتا ہے۔ مثلاً نقصِ اموال سے۔ نقصِ جان اور

نقص ثمرات سے بھوک سے پیاس سے اور پھر اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے کہ وہ لوگ جس طرح ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اور وہ ثابت قدم رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہونے دو۔ جتنی بھی سختیاں ہو رہی ہیں ہونے دو۔ ہم تو اللہ ہی کے لئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان پر درود اور اپنی رحمت بھیجتا ہے۔ پھر امام فرماتے ہیں اس لئے ہم کو یہ اعزاز دیا گیا۔ یہ بلندی دی گئی کیونکہ ہمارے ہاتھ میں ایک جھنڈا ہے ایک عَلَم ہے۔ اور وہ علم و ہدایت۔ عدل اور تقویٰ کا نشان ہے اور اسی لئے ہم کو اس اعزاز کے قابل سمجھا گیا کہ ہم کو اس آزمائش سے گزار اجائے اور اسی اللہ نے ہم کو صبر اور استقلال دیا جس کے ذریعے سے ہم اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور گمراہی اور ہلاکت کا علم ہمارے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے جو ہم سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ بیان سید الساجدینؑ منبر سے ایسے مجمع میں دے رہے ہیں جہاں دربار شام اپنی پوری شان و شوکت سے آراستہ ہے اور مشاہیر عالم۔ سلطنت کے عمائدین۔ اور معززین شہر موجود ہیں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں چھ خصوصیات بخشی ہیں اور ہمارے لئے مخصوص کی ہیں۔ ہمارے سے مقصد اہلِ بیت ہیں۔ علم، حلم، شجاعت، سخاوت مومنوں کے دل میں ہماری محبت اور چھٹی اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے گھر میں قرآن اترا۔ ملائک ہمارے گھر میں آتے تھے اور ہم تمام رسولوں کی امانتوں کے خزانہ دار اور وارث ہیں۔ اب ذرا ایک ایک صفت پر غور کرتے چلئے "علم ہم کو دیا" یہ علم کتاب و حکمت ہے۔ زندگی کے اٹل اصول ہم کو دیئے۔ اور زندگی کو بدلتے ہوئے حالات میں ان اصولوں کا اطلاق کرنے کی حکمت ہم کو دی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کس

دماغ پر جارہا ہے۔ ہمارا ہاتھ زمانہ کی نبض پر رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زمانہ کو کس وقت کس شے کی ضرورت ہے۔ اگر زمانہ کو خونِ حسینؑ کی ضرورت ہے تو ہم خونِ حسینؑ دیتے ہیں۔ اور "ہمیں حلم دیا" یعنی جذبات پر قابو پانا جہاں نفس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ ضمناً بتاتا چلوں کہ ابوتراب کے معنی بھی یہی ہیں۔ ابوتراب یعنی مٹی کا باپ گویا وہ جو وقت کا غلام نہیں ہے۔ بلکہ صاحبِ زمانہ ہے تو حلم کا مطلب ہوا وہ کہ جن کو اپنے جذبات پر پورے طور سے قابو ہے یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر قیامتیں گزر جائیں تو ان کی پروا نہیں ہوتی۔

شجاعت۔ یعنی ہم وہ لوگ ہیں جو خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اور جب خدا کا ڈر ہے تو پھر شجاعت کا Discipline کتنا زبردست ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ہم شجاعت دکھاتے ہیں۔ جب اس کی مرضی نہیں تو ہم تلوار کو میان میں رکھ لیتے ہیں اور ضبط کرکے دکھاتے ہیں، ہم وہ نہیں جو اپنی بہادری کے ہاتھوں میں کھیلیں۔ یہ کہتے وقت عجب نہیں کہ مولیٰ کو حضرتِ عباسؑ کی شجاعت یاد آگئی ہو۔ "ہمارے گھر میں سخاوت ہے۔" یعنی ہم چیزوں کو جمع کرکے رکھنے والے نہیں۔ بلکہ دینے والے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ دینے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو بہت دیا ہے۔ گھر میں فاقہ ہو اور دروازہ پر تمام کی تمام خلقت سوالی ہو۔ یہ سیدہؑ کے گھر کی شان ہے Magnanimity ہے۔ اگر جان کی ضرورت ہو تو جان حاضر ہے۔ مال کی حاجت ہو تو جو کچھ حاضر ہو وہ حاضر ہے۔ ضمناً یہ عرض کردوں کہ مومن کی شان جو اللہ نے بیان کی ہے وہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ اللہ اس کو دے وہ خرچ کرے۔ "ومما رزقنٰھم ینفقون" اور جمع کرنے والے کافروں کی نشانی بتائی گئی ہے کہ جو سونے اور چاندی کے ڈھیر جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور ان کو

بشارت دو کہ جن سونا چاندی آگ میں تپا کر ان سے ان کے پہلوؤں اور جبینوں کو داغا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ انعام ہے کہ اس نے ہماری محبت مومنوں کے دلوں میں ڈال دی ہے۔ دلوں کا حاکم اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ مقلب القلوب ہے۔ اللہ جن بندوں سے محبت کرتا ہے اس محبت کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت قائم کر دیتا ہے۔ یہ حکومت اس حکومت سے بہت مختلف ہے جو کوئی ظالم عارضی طاقت کے نشہ میں اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنا کر حاصل کرتا ہے جس میں بالجبر لوگوں کے سر جھکائے جاتے ہیں۔ یہ دلوں کا جھکنا ہے۔ طاقت سے نہیں بلکہ محبت سے مجبور ہو کر دلوں کا جھکنا ہے اور یہ ایسی حکومت ہے جس کو زوال نہیں جس کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ دنیا کے ظالم اور حاسد اللہ کے محبوب بند کو جتنا ذلیل کرنا چاہتا ہے لوگوں کے دلوں میں ایک زمانہ یا ایک نسل میں نہیں بلکہ نسل در نسل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کی عزت بڑھتی ہے۔ اور یہ محبت اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔

اور یہ شان ہے ان کی جو قرآن کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ہدایت جن کے شامل حال رہتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ وہ عزت دیتا ہے جس کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ بلکہ جتنا ظالم اس کو مٹانے کی کوشش کریں اتنی ہی وہ بڑھتی ہے جن کے ذکر کو اللہ تعالیٰ بلند کرتا ہے اور جن کے ملک کو لوگوں کے دلوں میں قائم رکھتا ہے اور جس ملک کو کبھی زوال نہیں۔

وہ جس کو بڑی ضد سے مٹاتا ہے زمانہ   اس نقش کو لے کر ابھرتی ہے زمین اور

(علامہ رشید ترابی)

نویں مجلس

تمام تعریف اللہ کے لئے ہے جو حی ہے اور قیوم ہے اور اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے احسن عمل کرنے والا کون ہے۔

اور میں درود بھیجتا ہوں محمد مصطفیٰ پر جس نے لوگوں کے شعور کو بیدار کیا۔ وہ کہ جس نے کانوں کو سننا اور آنکھوں کو دیکھنا سکھایا۔ قلب کو سمجھنا سکھایا۔ وہ کہ جس نے زندگی کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کیا وہ ذاتِ گرامی جس نے لوگوں کے سامنے سے غفلت کے پردے ہٹائے۔

اور ہمارا اسلام ہو ان آئمہ اطہار پر جن کا وجود خود غفلت کو دور کرنے والا تھا۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن آیت اور روشن نشانی تھی۔ اس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں آپ کو کسی جگہ یہ بات نہیں ملے گی کہ نسلاً بعد نسلاً کو نسلیں ایسی گزریں کہ جس میں ایسا معلوم ہو کہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوتا چلا جا رہا ہو۔

عزیزانِ گرامی۔ میں نے خطبہ میں جس آیت کا ترجمہ بیان کیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو حی کہا ہے۔ لیکن اس کی حیات ایک خاص معنی میں ہے۔ ہر وجود کے مقابلے میں ایک عدم ہوتا ہے۔ ہر حیات کے مقابلے میں موت ہوتی ہے۔ مگر اللہ Being in itself ہے۔ اس کا وجود وہ ہے جس کے مقابلے میں عدم نہیں۔ یہ وہ حیات ہے جس کے مقابلے میں موت نہیں۔ وہ

وجود کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہ خود Absolute Existence ہے۔ اس کا وجود Absolute ہے۔ مگر یہ دنیا اضافی دنیا ہے۔ اس میں ہر چیز اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے زندگی کو پیدا کیا اور اس کے مقابلے میں موت کو پیدا کیا۔ ہمارے نزدیک یہ زندگی اور موت ہے۔ وجود عدم ہیں۔ اللہ کے نزدیک اس میں کوئی فرق نہیں۔ جیسی زندگی ہے ویسی ہی موت ہے۔ جیسا عدم ویسا وجود۔ وہ موت میں سے زندگی کو نکالتا ہے اور زندگی میں سے موت کو نکالتا ہے اور ہر چیز اللہ کی پاکیزگی کو بیان کرنے والی اور اس کی تعریف کرنے والی ہے۔ کیوں کہ ہر چیز کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ جس چیز کو عدم Nothing کہا جاتا ہے اس میں اور Thing میں اللہ کے نزدیک فرق نہیں ہوتا۔ اور اس زندگی کی اس نے بہت سی کیفیات پیدا کیں اور بہت سی شانیں پیدا کیں بلکہ اکثر مفسرین تو بتلاتے ہی یہ ہیں کہ عالمین کے معنی ہیں زندگی کی مختلف کیفیتیں۔ انالوں میں دیکھئے کہ شہدا کے متعلق ہے کہ جو لوگ شہید ہو گئے ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں اور اپنے اللہ کی طرف سے رزق پاتے ہیں اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ایک طرح سے جو چیزیں عدم میں جاتی ہیں تو وہ بھی موجود ہوتی ہیں۔ حیات بعد الموت پر تو سب کو یقین ہے۔ خاص کر شہدا کے لئے اسی لئے کہا گیا ہے۔ بقول ہمارے مفسرین، آئمہ اور امام جعفر صادقؑ کے کہ دو زندگیاں ہیں۔ ایک تو سونے والے آدمی کی زندگی ہے اور ایک جاگنے والے آدمی کی زندگی ہے۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق بھی پہنچ رہا ہے۔ یعنی زندگی دوسرے لوگوں کی بھی ہوتی ہے مگر وہ Dormant زندگی ہوتی ہے۔ شہیدوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اسی طرح زندہ رہتے ہیں جیسے وہ لوگ جو

اس دنیا میں زندہ ہیں۔ گویا زندگی کی اللہ نے مختلف کیفیتیں پیدا کی ہیں اور انسانوں میں مختلف مراتب رکھے ہیں۔ اس دنیا میں ہر چیز دوسری چیز سے مختلف ہے۔ یہ اس کی انفرادیت ہے۔ یہ انفرادیت وہ ہے جو اس کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اور جو اس کی ذات کی خصوصیت ہے لیکن عزیزان گرامی کوئی دو چیزیں اتنی مختلف نہیں ہوتیں۔ اور اتنا فرق ان میں نہیں ہوتا۔ جتنا ایک انسان اور دوسرے انسان میں ہوتا ہے۔ یہ بات انسانی حیات سے مخصوص ہے۔ اور دوسرے جانداروں میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے Types کے نمائندے ہوتے ہیں۔ لیکن انسانوں میں یہ انفرادیت۔ یہ خودی ایسی ہوتی ہے کہ انسان کے اور انسانی زندگی کے لاانتہا مراتب ہوتے ہیں اور اس فرق کے مطابق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ بلندی سے زیادہ بلند اور پستی سے زیادہ پست ہونے والا یہ انسان ہی ہے۔ کسی اور جاندار میں اتنا فرق نہیں ہوتا۔ اسی لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے مختلف زمانوں میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے اور وہ خود ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کیا۔ یعنی بہترین صلاحیتیں دے کر پیدا کیا۔ اور اس کے بعد جب وہ پستی کی طرف گرجاتا ہے تو اسفل السافلین تک پہونچتا چلا جاتا ہے۔ تو آخر یہ کھیل کیوں رچایا گیا اس دنیا کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ اس لیے تاکہ وہ صلاحیتیں ظاہر ہوں۔ ہم نے موت اور زندگی کو پیدا کیا۔ تاکہ آزمائیں کہ احسن عمل کرنے والا کون ہے۔ تو انسان میں جو صلاحیتیں اور یہ Potentialities ہیں وہ ظاہر ہوتی ہیں اور ہر شے اپنی تکمیل تک پہونچتی ہے۔ جس راستہ پر بھی ہوتی ہے اپنی تکمیل تک پہونچتی ہے۔ اس جگہ ایک بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہم کو صلاحیتیں

دی ہیں وہ ہمارا جبر ہے۔ اور جس طرح ہم ان کو استعمال کرتے ہیں وہ ہمارا اختیار ہے۔ جناب امیر المومنین حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ایک ٹانگ اٹھا کر کھڑا رہنا اختیار ہے۔ دونوں ٹانگیں بیک وقت اٹھا کر کھڑا رہنا جبر ہے۔ یعنی انسان مجبور ہے۔ صلاحیتیں ہمارے اندر مختلف ہیں۔ ہم سے جو سوال کیا جائے گا یا ہم جس کے ذمہ دار ہیں وہ یہ کہ ہم میں جو صلاحیتیں ہیں ہم نے ان کو استعمال کیا یا نہیں۔ ہم سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ ہمارا درجہ وہ کیوں نہ ہوا جو حضرت علیؓ کا تھا۔ ہاں یہ ضرور سوال کیا جائے گا کہ تم وہ کیوں نہیں بنے جو بننا چاہئے تھا۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار کیوں نہیں لائے جتنی بلندی تک پہونچ سکتے تھے۔ وہاں تک کیوں نہیں پہونچے۔ انسانوں کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ جن حالات میں وہ پیدا ہوتا ہے وہ مختلف ہوتے ہیں۔ اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے یا نہیں۔ اور کوئی صورت اتنی گئی گزری ہوئی نہیں ہوتی کہ اس میں انسان کوئی نیکی نہ کر سکے یہ ناممکن ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ موت اور زندگی اس لئے پیدا کی اور پھر ہمیں یہ بات بتائی کہ زندگی کے مختلف مدارج اور مراتب ہیں۔ ان مدارج کی کوئی انتہا نہیں نہ بلندی کی طرف نہ پستی کی طرف۔ اور پھر ہم کو بتایا کہ دنیا میں جو تم کو بھیجا ہے وہ امتحان کے لئے بھیجا ہے۔ اور ہمارا امتحان کس کس طرح سے ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو ہمیں اپنی طرف لبھاتی ہیں۔ اور وہ چیزیں ہیں جو اپنا خوف دلاتی ہیں۔ ان کے ذریعہ ہمارا امتحان ہوتا ہے۔ ہمارے اندر خواہشات ہوتی ہیں۔ ہمارے دلوں میں تمنائیں ہوتی ہیں۔ ہم میں ہوا اور ہوس ہوتی ہے۔ اکثر ادیان میں تو یہ

ہے کہ فطرت کے کچھ داعیات اور زاویے اچھے ہوتے ہیں اور کچھ برے۔
اس کے برخلاف ہم یہ کہتے ہیں کہ فطرت کے تمام زاویے نہ اچھے ہوتے
ہیں نہ برے۔ اگر تم ان کو اچھی طرح استعمال کرتے ہو تو وہ اچھے ہیں۔ اور اگر بری
طرح استعمال کرتے ہو تو برے ہیں۔ دینِ اسلام کا نظریہ یہ ہے۔ کچھ دین بتاتے
ہیں کہ دنیا میں حصہ لینا۔ دنیا کی خواہشات رکھنا۔ عورتوں کی طرف میلان ہونا یا غصہ
کرنا یہ سب بری باتیں ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک مقام ہے
اسی کو عدل کہتے ہیں۔ اگر اس خواہش کو اس کے مقام پر رکھا جائے۔ اور اس راستے
سے وہ تقاضے پورے کئے جائیں جس کی اجازت مذہب دیتا ہے تو وہ بہت
اچھے ہیں۔ اور اگر غلط راستے سے وہ تقاضے پورے ہوں تو وہ برا ہے۔ ہاں غصہ
اکثر جگہ برا ہوتا ہے۔ لیکن اکثر جگہ نرمی بھی بری ہوتی ہے۔ غصہ کا بھی ایک مقام ہے اور
عفو کا بھی ایک مقام ہے۔ نہ غصہ بذاتِ خود برا ہے۔ نہ عفو بذاتِ خود اچھی ہے بلکہ
دونوں اپنے اپنے مقام پر اچھے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی بات بری نہیں لگتی۔ آپ
کو کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ آپ اپنے چاروں طرف ظلم اور شر دیکھتے ہیں۔ آپ
دیکھتے ہیں کہ ایک طاقتور ایک مظلوم پر ظلم کر رہا ہے اور آپ کو غصہ نہ آئے آپ کو
برا محسوس نہ ہو تو پھر آپ یہ سمجھیں کہ آپ کے ایمان میں کمزوری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ
عفو بھی ایک کمزوری ہو۔ عفو کا بھی ایک مقام ہے اور غصہ کا بھی ایک مقام ہے۔

دینِ اسلام کا فطری داعیات کے متعلق جو نظریہ ہے وہ یہ کہ یہ سب
تمہارے امتحان کے لئے ہے۔ یہ تمہاری خواہشات۔ تمہاری شہوات۔ یہ
تمنائیں۔ یہ تمام فطرت کے داعیے سب اس لئے ہیں کہ دیکھیں کہ ان کو تم
کس طرح استعمال کرتے ہو۔ اور زندگی میں جو ہمارا امتحان ہوتا ہے وہ کہ اس
دنیا کے اندر ہر کمال کے بعد ایک زوال آتا ہے۔ صحت کے بعد بیماری

آتی ہے۔ زندگی کے بعد موت آتی ہے۔ ہر وصل کے بعد فراق ہوتا ہے۔ ہم یہاں اس لئے ملتے ہیں کہ جدا ہوں۔ اس دنیا میں ہر چیز حتیٰ کہ بھوک خوف یہ سب ہمارے امتحان کے پرچے ہیں۔ اور ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا ہے کہ اس پرچے میں کیا کیا سوالات ہیں کون کون سے Temptations اور کون کون سے خطرات ہمارے سامنے رکھے گئے ہیں۔ کس کس طریقہ سے شیطان ہمیں بہکاتا ہے۔ اور ہم کو اللہ کے رسول نے ایک ایک چیز بیان کر کے اور ایک ایک چیز کی تفسیر کر کے بتا دیا کہ نفس کس طرح سے دھوکہ دیا کرتا ہے اور کس طرح آدمی Temptations میں گھرتا ہے۔ کس طرح خوف اس کے دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ کس طرح Insecurity اور عدم استقلال کا احساس اس میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں ہم کو اللہ کے رسول نے اور اس کے مقرر کردہ اماموں نے بتا دی ہیں۔

اس دنیا کو اللہ نے بتایا ہے یعنی خسرا" نقصان۔ خسارہ کی جگہ۔ انسان اس situation میں ہے یعنی وہ نقصان میں ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز مائل بہ زوال ہے اس کے بعد اللہ وہ راستہ بتاتا ہے جو اس نقصان اور اس خسارے کی وادی سے سلامتی سے گزرنے کا ہے۔

قرآن پاک میں خاص اصطلاح میں دو قسم کی زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے ایک تو ہے حیاتِ دنیا۔ دنیا اور عالم عام طور سے ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ان connotation مختلف ہیں معنی کی جھلک ایک ہی ہے مگر نفس کی گہرائی مختلف ہے۔ دنیا کے معنی کمینی اور پست چیز کے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ "اے دنیا تو کتنے بناؤ سنگھار کر کے میری طرف آتی ہے مگر میں تو تجھ کو تین طلاق دے چکا ہوں۔ دنیا کا مفہوم لبھانے والی۔ بہکانے والی کا ہوتا ہے۔

عالم علم سے ہے۔ جس کے معنی ہیں نشان۔ یعنی وہ چیز جو کسی اور حقیقت کا
نشان دینے والی ہو۔ جو کسی اور حقیقت کو بتانے والی ہو۔ یہ تمام کی تمام دنیا
جو اللہ کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے تو جس وقت دنیا کے اس پہلو کا ذکر
کرتے ہیں تو عالم کہتے ہیں۔ اور جس وقت دنیا کے غرور لالچ اور دھوکوں کا ذکر
کرتے ہیں تو اس وقت لفظ دنیا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ کلام پاک میں جو اصطلاح
آئی ہے۔ وہ حیاتِ دنیا کی آئی ہے۔ کہ یہ حیاتِ دنیا دو روزہ ہے قلیل ہے
ایک تو اس حیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور دوسری حیاتِ ایمانی یا حیاتِ طیبہ کا ذکر
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ان دونوں کا واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔ حیاتِ
دنیا کے لئے کہا گیا ہے کہ یہ لہو ولعب ہے۔ جو اصل مقصد سے غافل ہو کر زندگی
کی دلچسپیوں میں کھو جائے جس طرح کوئی بچہ کھیل کود میں لگا رہے۔ اور زندگی
کے serious aspects کو بھول جائے کبھی موت کی حقیقت پر غور نہ
کرے۔ کبھی زندگی کی حقیقتوں پر توجہ نہ دے۔ اور دولت اور طاقت کے کھیل
جو ہمیں دے دیئے گئے تو ہم ان میں مصروف ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس
کو لہو ولعب کہا ہے۔ یعنی ایسا کھیل جس میں آدمی مصروف ہو جائے۔ اور
یہ نہ سوچے کہ زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔ اس سے غافل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ
نے قرآن پاک میں اس کے لئے اور جو دو الفاظ استعمال کئے ہیں وہ عجیب ہیں
وہ فرماتا ہے کہ یہ تکاثر ہے اور تفاخر ہو۔ تکاثر چیزوں کی کثرت - Good Thi-
ngs of life۔ یعنی جتنی زیادہ ایسی چیزیں تمہارے پاس جمع ہو جائیں اتنی
ہی زیادہ تمہاری زندگی اچھی سمجھی جائے۔ تکاثر کے معنی کثرت کی کوشش کرنا بھی
ہیں۔ اقتدار یا دولت کے اعتبار سے کس طرح کثرت کی ہوس کرنا تاکہ تمہارے
پاس دولت زیادہ ہو جائے۔ تمہارے گرد ماننے والے زیادہ جمع ہو جائیں اور

تمہارا اقتدار بہت بڑھ جائے۔ یہ ہے تکاثر جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر" یعنی آدمی اس کثرت کے پیچھے دوڑے چلا جاتا ہے کہ یہ مال زیادہ ہو جائے۔ وہ چیز بہت بڑھ جائے۔ ہماری اولاد اقتدار کے اندر بڑھ جائے۔ ہمارا اقتدار بڑھتا ہے "حتیٰ زرتم المقابر" اور اسی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے یہاں تک وہ جگہ دیکھ لیتا ہے جہاں اس کی مٹی مٹی میں مل جاتی ہے۔ اور تمام کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس تکاثر کے ساتھ جو لفظ ہے وہ تفاخر ہے تفاخر کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان سب چیزوں پر غور کرو تو نہ یہ تمہاری زندگی کے لئے ضروری ہیں اور نہ تم کو بہت زیادہ آرام پہنچانے والی چیزیں ہیں۔ البتہ اس سے تمہارا ایک جذبہ تسکین پاتا ہے اور وہ ہے دوسروں کے سامنے بیٹھ کر فخر کرنا۔ یہ فخر کرنا کہ تمہارے پاس ایک مکان ہے یا دو منزلہ مکان ہے۔ اور میرے پاس چار منزلہ مکان ہے۔ تمہارے پاس اتنی دولت ہے تو میرے پاس اس سے بہت زیادہ دولت ہے۔ تمہارے پاس اتنی طاقت اور اقتدار ہے تو میرے پاس اس سے کہیں زیادہ ہے۔ تو ان چیزوں سے صرف یہ تفاخر کا جذبہ پورا ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں تفاخر کے لئے ہیں۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ زندگی کے لئے کتنی چیزوں کی ضرورت ہے تو اس کو معلوم ہوگا کہ وہ ضروریات بہت مختصر ہیں۔ مگر یہ مقابلہ اور یہ competition کا جذبہ جس کو اللہ نے تفاخر کہا ہے آدمی کو دیوانہ بنائے رکھتی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں بتایا ہے کہ یہ دنیا لہو و لعب ہے تکاثر اور تفاخر ہے۔ اور یہ کھیل چل رہا ہے کہ تمہارے پاس اتنا ہے تو میرے پاس اتنا ہے اس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے اور وہ وقت آتا ہے جب یہ سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔ خدا نے بتایا ہے کہ یہ جو تمہارا کھیل ہے یہ متاع غرور ہے۔ غرور کے معنی دھوکا۔ یہ دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس دھوکے میں نہ آؤ۔ یہ ایک متاع قلیل ہے

کتنے دنوں کی بات ہے اور کہاں تک کی بات ہے۔ ہوس کا پیٹ کس نے بھرا ہے
یہ بھوک تو وہ ہے کہ جتنا کھاتے چلے جاؤ اتنا ہی یہ بھوک بڑھتی چلی جاتی ہے۔
اور یہ خوف بھی وہ ہے کہ جتنے ڈرو گے اتنا ہی زیادہ ڈرتے چلے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ
نے ایک چھوٹی سی آیت میں بتایا ہے کہ یہ جوع یعنی بھوک اور خوف اس کو میں بتاؤں
کہ کس طرح سے دور ہوتا ہے۔ "فلیعبدو رب ھذا البیت الذی اطعمھم
من جوع و آمنھم من خوف (قریش) اس بیت کے رب کی عبادت کرو تم کو
بھوک سے سیری بھی ہو جائے گی۔ اور خوف سے امن ہو جائے گا۔ اس کے
علاوہ تم اگر دوسرا راستہ اختیار کرو تو خواہ وہ فرد کی بات ہو یا قوم کی بات
ہو۔ تمہارے پاس جتنی دولت ہو جتنی چیزیں ہوں سیری نہیں ہوتی پھر یہ کہ فلاں
ملک میں یا فلاں خاندان میں اتنی دولت ہے تو کم از کم ہمارا standard اس
سے بڑھنا چاہیئے اور تمہارے خوف کی یہ حالت کہ جتنا زائل کرتے چلے جاؤ گے
اتنا ہی بڑھتا جائے گا کیونکہ تمہارا رقیب یعنی دوسری قوم بھی اتنی ہی تیاریاں
کرتی جاتی ہے۔ آج جو قومیں جتنی زیادہ دولت رکھتی ہیں جتنی زیادہ طاقت رکھتی ہیں
ان میں جتنی جوع اور جتنا خوف ہے وہ ہم فقیر مست مولا قوموں میں نہیں ہے۔ ملک
پر جب تباہی آئے گی دنیا ختم ہو گی تو ان کا بھی جائے گا ہمارا بھی نقصان ہو گا۔
مگر جتنا زیادہ خوف ان قوموں کے دلوں میں ہے جن کے پاس خوف دور کرنے کا
زیادہ سامان ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں ان قوموں کے دلوں میں خوف کم ہے
جن کے پاس مقابلتاً کم سامان ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کے پاس بھوک کو
زائل کرنے کے تمام ذرائع ہیں ان کو اتنی بھوک ہے جو کبھی پوری ہی نہیں ہوتی
اتنی بھوک ان قوموں میں نہیں ہوتی جو واقعی بھوکی ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے جوع
اور خوف کو یوں بیان فرمایا ہے اور ہم کو حیاتِ دنیا کی تصویر دکھاتی ہے اور اسکی

وجہ یہ بتائی ہے کہ تمہاری جو خواہشات ہیں۔ شہوات ہیں اپنی بیویوں گھر اور اولاد
کے متعلق۔ سونے اور چاندی کے ڈھیروں کے واسطے جو لالچ ہے۔ اور
گھوڑوں کے رسالے کے متعلق (یہ اس زمانے میں بڑے پن کی نشانی
سمجھی جاتی تھی۔ symbol of status) یہ بھیڑ بکریاں۔ یہ تمہاری
کھیتیاں۔ ان سب کی تمہاری نگاہوں میں زینت دے دی گئی ہے۔ ان
میں تمہارے لئے کشش ہے۔ کلام پاک ایک بلیغ اصطلاح میں فرماتا ہے
کہ یہ سب متاعِ حیات ہیں۔ مقصدِ حیات نہیں۔ یہ سب تمہاری زندگی کو accommodate
کرنے والی چیزیں ہیں۔ یہ تم کو مبارک ہوں۔ مگر ان کو مقصدِ حیات نہ سمجھ بیٹھنا
کیوں کہ اگر تم نے ان کو مقصدِ حیات سمجھ لیا تو تم گمراہ ہوئے اور ہلاکت کی طرف
گئے۔ اس جال میں پھنسنے کا سبب یہی ہے کہ انسان متاعِ حیات کو مقصدِ حیات
سمجھ لیتا ہے۔ جو چیزیں کہ اس کی غلام ہیں اور جن سے وہ خدمت لینا چاہتا
ہے وہ خود ان کا غلام بن جاتا ہے۔ وہ نفس کہ جو اس کے قابو میں ہونا چاہیے
تھا۔ اب وہ خود اس نفس کے قابو میں آجاتا ہے۔ اور دیوانوں کی طرح مارا
مارا پھرتا ہے۔ کیا تم نے اپنے آپ کو محض ایک جانور سمجھ رکھا ہے جو کھاتے
پیتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ تم نے یہ بات نہ سمجھی کہ تمہاری کوئی destiny
ہے اور وہ تمہاری تقدیر جو ہے وہ ان سب چیزوں سے بلند ہے اس
کے لئے تم نے کیا کیا۔ تم کیسے آدمی بنے۔ تم نے quantity کی طرف
دیکھا quality کی طرف نہیں دیکھا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے
اندر جو روشنی رکھی ہے۔ وہ کہیں مدہم تو نہیں ہوتی جارہی ہے۔ کہیں تمہاری
روح خشک تو نہیں ہوتی جارہی ہے۔ کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھو
کہ تمہاری کیا کیفیت ہے۔ تم میں کتنا خوف ہے۔ تم میں کتنی کمزوریاں ہیں تو

خداوندِ عالم بتاتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے متاعِ حیات کو مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ دنیا بذاتِ خود اپنے طور پر بری نہیں ہے۔ ہماری تعلیم ترکِ دنیا نہیں ہے بلکہ اس دنیا کو صحیح طور پر یا غلط طور پر استعمال کرنا ہمارا امتحان ہے اور امتحان سے بھاگ کر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اس دنیا کی سچائی کو سمجھ گیا اور اس کی سچائی کی تصدیق کی۔ اس کے لئے یہ دنیا دار الصدق ہے۔ (یعنی ہر چیز کو آپ سمجھیں تو سہی کہ دنیا کو کیوں پیدا کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیاتِ دنیا کو لہو و لعب کہا ہے لیکن اس دنیا کے لئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم نے جس چیز کو بھی پیدا کیا ہے وہ حق کے ساتھ اور ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے) حضرت علیؑ مزید فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس کی چالوں کو سمجھ گئے اور اس کی باتوں کو سمجھ گئے ان کے لئے یہ دنیا دارِ عافیت ہے۔ (یعنی اگر یہ سمجھ گئے کہ یہ Temptations ہیں یہ دعوت ہے۔ یہ غرور اور دھوکا ہے۔ اگر یہ سمجھ گئے کہ اس کی اچھائی جو معلوم ہو رہی ہے یہ نمائشی ہے عزیزو تمام ایسی زندگیاں نمائش ہیں۔ وہ glitter کرتی ہیں جو اس بات کو سمجھ گیا دھوکوں کو سمجھ گیا تو ظاہر ہے کہ اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح یہ دنیا دارِ عافیت بن گئی) اور جو شخص یہ چاہے کہ اس دنیا سے زادِ راہ لے لے (زادِ راہ کے معنی ہیں سفر میں کام آنے والی چیزیں) تو یہ دنیا بڑے مال کی جگہ ہے (یعنی اگر آپ دنیا میں نیکی کرنا چاہیں تو بہت مواقع ہیں اس کی کوئی حد ہی نہیں ہے) اس جگہ مجھے معاویہ اور امام حسنؑ کے درمیان ایک خط و کتابت یاد آ گئی جس کا ذکر کرتا ہوں۔ امام حسنؑ کا ہاتھ اپنے خاندان کی روایت کے مطابق بہت کھلا ہوا تھا۔ گھر میں کچھ بھی حالت ہو لیکن داد و دہش جاری تھی۔ معاویہ

جو دنیاداری اور دنیاداری معاملات میں بہت عقل مند سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے امام حسنؑ کو نصیحت کی کہ "لا خیر فی الاسراف" یعنی اسراف میں کوئی اچھائی نہیں اس پر امام حسنؑ نے جواب دیا "لا اسراف فی الخیر" نیکی کے کاموں میں کوئی اسراف نہیں۔ نیکی تو وہ ہے کہ جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ تو جناب امیر فرماتے ہیں کہ "یہ دنیا بہت غنی ہے۔ اس سے جتنا زادِ راہ لے سکتے ہو لے لو یعنی جتنی نیکی کر سکتے ہو کر لو" اور اگر تم اس دنیا سے عبرت حاصل کرنا چاہو تو یہ بہت بڑی یونیورسٹی ہے۔ دارِ موعظت ہے۔ قدم قدم پر سبق دیتی ہے۔ اور preach کرتی ہے اس کے خطبات sermons ہیں تو ایک ایک پتھر سے عیاں ہیں قدم قدم پر نشانیاں ظاہر ہیں۔ "یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے دوستوں کی مسجد ہے۔ یہ دنیا ملائک کا مصلیٰ ہے اور یہ دنیا وہ جگہ ہے کہ جہاں اولیا اللہ اپنے اللہ سے سودا کرتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں رضائے الہٰی اور جنت پاتے ہیں۔

حضرت علیؑ کے ان ارشادات میں دنیا اور زندگی کے فلسفہ اور اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ملتی ہے۔ یہ تو اللہ کی بنائی ہوئی دنیا کی زندگی ہے۔ پھر حیاتِ ایمانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "لوگو دیکھو کہ نیکی اس بات میں نہیں کہ تم نے منہ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔ بلکہ نیکی اس میں ہے کہ تم اللہ پر ایمان لاتے ملائکہ اس کی کتابوں۔ اس کی ہدایتوں اور نبیوں پر ایمان لاتے۔ تو دنیا تو جیسی ہے ویسی رہتی ہے۔ اور ایمان کو catalyst سمجھو کہ سارا کمپاؤنڈ سارا مرکب بدل جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں آتی تو یہ ایمان ایسی چیز ہے کہ جب تم نے اس کو زندگی کے کمپاؤنڈ مرکب میں داخل کر دیا تو تمام زندگی کے معنی تو بدل جاتے ہیں۔ خود زندگی بدل جاتی ہے۔ مگر ایمان اپنی جگہ ویسا کا ویسا ہی رہتا ہے۔

حیاتِ ایمانی کے لئے بتایا گیا ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسولوں پر۔ اس کی کتابوں پر اور یوم آخرت پر اور اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں خرچ کرو۔ اپنے اقرباء کو دو۔ مساکین کو دو۔ مسافروں کو دو اور ان لوگوں کو دو کہ جو مجبور ہیں۔ اور نیکی کس چیز میں ہے۔ اقام الصلوٰۃ۔ اور ایتائے زکوٰۃ میں ہے۔ اگر اقام الصلواۃ کا مطلب پانچ وقت کی نماز پڑھنا ہے اور ایتائے زکواۃ کا مطلب حکومت کا ٹیکس ادا کرنا ہے تو پھر عزیزو یہ بتاؤ کہ امام حسینؑ کی زیارت جو تم پڑھتے ہو اس میں کہتے ہو کہ اے مولا ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ تو نے نماز کو قائم کیا اور ایتائے زکواۃ کی۔ تو کیا ہم ایسے بے بصیرت آدمی ہیں کہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ہاں امام حسینؑ پانچ وقت کی نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور حکومت کا ٹیکس وقت پر ادا کر دیا کرتے تھے۔ یہ بات کوئی امام کی شان میں کہنے کی ہے۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اقام صلواۃ اور ایتائے زکوٰۃ کوئی ایسی زبردست بات ہے کہ جس کی ہم اپنے امام کے لئے شہادت دیتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اقام الصلواۃ پر ایتائے زکواۃ زندگی کے رویے ہیں۔ یہ دو نظام ہیں۔ اقام الصلواۃ کا مطلب یہ ہے کہ جس جگہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا ہے اس جگہ کسی ظالم کی حکومت نہیں ہے۔ کسی جابر کی حکومت نہیں ہے۔ کوئی کسی کو غلام نہیں بنا سکتا کوئی ظلم پنپ نہیں سکتا اس لئے کہ اس معاشرہ میں اللہ کی حاکمیت ہے۔ اکبر کے معنی ہیں Absolutely great with-out any companion اللہ اکبر کے معنی ہیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ تو اقام الصلواۃ کے معنی یہ ہوئے کہ امام حسینؑ نے ان دنیاوی خداؤں کا مقابلہ کیا۔ آپ نے ان کا انکار کیا۔ آپ نے یہ بت یہ ظلم کے بت توڑے۔ اس دولت کے بت توڑے جو انسانی مساوات کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے ان کو نیچا دکھایا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کیا۔ آپ نے اپنی زندگی

میں اپنے قول و فعل سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اعلان کیا۔ اور اثبات کیا۔ اثبات کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی کو دیکھ کر لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ کس خدا کا بندہ ہے۔ زندگی اس طرح سے گزاری کہ جس طرح نماز کے لئے کوئی بندہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ مولا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے اقام الصلوٰۃ کیا اور ایتائے زکوٰۃ کے لئے کہا گیا ہے کہ لوگو! تمہیں جو کچھ بھی دیا گیا ہے۔ وہ ایک امانت ہے دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ تم اس کے قاسم ہو۔ اس میں سے جو جو بھی حقدار ہیں ان کو پہنچا دو۔ یہ مال تمہارا نہیں ہے۔ تو ہم زیارت میں کہتے ہیں کہ مولا اللہ تعالیٰ نے آپ کو جتنی بخششیں کی تھیں۔ اور کرم فرمایا تھا وہ اقتدار کے لحاظ سے ہو یا دولت کے لحاظ سے ہو اس کو آپ نے کبھی اپنا نہیں سمجھا بلکہ مخلوق خدا تک پہونچاتے رہے۔ اور کسی چیز سے دریغ نہیں کیا۔ آپ وہ ہیں کہ آپ نے اس دنیا سے کچھ نہیں لیا۔ آپ وہ ہیں کہ آپ نے اس دنیا کو سب کچھ دے دیا علم آپ نے دیا۔ ہدایت آپ نے دی۔ اپنے پیاروں کی جانیں آپ نے دے دیں۔ اور اس دنیا سے اپنے لئے کفن تک لینے کے روادار نہ ہوئے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ "قد اقمت الصلوٰۃ و آتیت الزکوٰۃ" تو ایمانی زندگی کی تصویر یہ ہوئی کہ وہ لوگ اقام الصلوٰۃ کرتے ہیں۔ اور ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں اور جس وقت ان پر سختی ہوتی ہے۔ تو وہ صبر اور ثبات سے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ ایمانی زندگی کی نشانی ہے۔ حیاتِ دنیا کا میلان ہمیشہ پستی کی طرف ہوتا ہے۔ اور ایمانی زندگی کا میلان علو کی طرف ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی نہ پستی کی کوئی انتہا ہے اور نہ ایمانی زندگی کے علو کی کوئی حد ہے۔ اور دونوں میں فرق جو ہے وہ عملِ صالح کا ہے۔ عملِ صالح سے دنیاوی زندگی ایمانی زندگی میں بدل جاتی ہے۔ ہم لوگ جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور مومن ہونے کے مدعی ہیں تو ہمیں چاہئے کہ جتنا بھی ہمارے بس میں ہو ایمان اور عملِ صالح کا راستہ اختیار کریں۔

کچھ بندے خاصانِ خدا ہوتے ہیں۔ وہ خاص بندے وہ ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ اب یہ نفس ان کا نہیں رہا۔ اور جب یہ نفس درمیان سے ہٹ گیا تو پھر ان کے ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہو گئے۔ ان کی آنکھیں اللہ تعالیٰ کی آنکھیں ہو گئیں۔ زبان اللہ تعالیٰ کی زبان ہو گئی۔ جو چیز درمیان میں حائل ہے وہ نفس ہے اور جب یہ نفس درمیان سے ہٹ گیا تو بندہ ید اللہ، عین اللہ، لسان اللہ ہو جاتا ہے۔ "وتبتل الیہ تبتیلا" (مزمل ۸) سب چیزوں سے کٹ کر اللہ سے مل جائے۔ یہ وہ چیز ہوتی ہے کہ رب المشرق والمغرب "لا الہ الا ھو فاتخذہ وکیلا" یہ وہ مقام ہے جہاں ناصر بھی اللہ ہے اور وکیل بھی اللہ ہے۔ حکم دینے والا بھی وہی ہے اور گواہی دینے والا بھی وہی ہے تو یہ وہ خاصانِ خدا ہیں جو اقام الصلوٰۃ کرتے ہیں اور ایتائے زکوٰۃ کرتے ہیں اور جب سب کچھ دنیا کو دے دیتے ہیں۔ اور اس کا اجر نہیں لیتے اور جب اجر کا سوال آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارا اجر تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس لئے کہ یہ سودا تو اللہ تعالیٰ سے ہو رہا ہے ایک طرف دیکھو تو دشمنوں کا نرغہ ہے۔ دوسری طرف دیکھو تو اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندہ کو دیکھ رہا ہے اور اس پر فخر کر رہا ہے کہ کس طرح سے میرا یہ محبوب بندہ میرے حدود کا اثبات کر رہا ہے میری توحید کا علم بلند کر رہا ہے اور دنیا کو لا الہ الا اللہ کے معنی سمجھا رہا ہے۔ یہ تعلق اس بندہ کا اس اللہ سے ہوتا ہے تو اب یہ دیکھو کہ وہ کون سی چیز تھی۔ جو امام حسینؑ نے نہیں کی۔ وہ جو قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ لن تنالو البر ..... یعنی تم اس وقت تک نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک تم خدا کی راہ میں ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جو تم کو عزیز ہیں۔ اب یہاں یہ خیال رہے کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ اشد حب اللہ کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی شدید محبت ہوتی ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ دوسری محبتوں کو ختم کر دیا کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان کو تو بس اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ تو پھر سب عزیز مارے جائیں یا گھر لٹے تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بلکہ ہر آدمی کی زندگی میں ایک dominant pa- ssion ہوتا ہے۔ ایک اصول ہوتا ہے۔ دولت کمانا۔ اقتدار حاصل کرنا۔ اس دنیا

حاصل کرنا۔ یہاں تک کہ اس کی عبادت۔ مجلسیں کرنا۔ نماز پڑھنا سب اسی dominant passion کے تحت آتے ہیں اور اگر یہ dominant passion حُبِ الٰہی ہے تو پھر حسینؑ کو علی اکبرؑ سے جو محبت ہے وہ بھی اللہ کی محبت ہے۔ حضرت قاسم اور حضرت عباس سے محبت ہے وہ بھی اللہ کی محبت ہے۔ محبت بھی اللہ کے لئے ہے اور بغض بھی اللہ کے لئے ہے۔ کسی شے سے دشمنی یا لڑائی کسی ذاتی عداوت کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ بھی اللہ کی خاطر ہے اشد حب اللہ کی خاطر ہے۔

تو اب دیکھو کہ امام حسینؑ نے اللہ کی راہ میں کیا کیا دیا۔ جوان بوڑھے اور کم سن عزیز و اقارب اور دوستوں کو قربان کر دیا۔ ایک چھ مہینہ کا بچہ علی اصغر بچ گیا تھا اس کو بھی دے دیا۔ لڑائیاں ہوتی ہیں۔ جانیں جاتی ہیں لیکن ایک معصوم بچے کے مارے جانے کا قلب پر بہت اثر ہوتا ہے۔ امام زین العابدینؑ کو سب سے زیادہ جو تکلیف تھی وہ علیؑ اصغر کے قتل کی تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ سب سے زیادہ تکلیف علی اصغر کی شہادت کی تھی اس لئے کہ اور جو لوگ قتل ہوئے وہ میدان میں گئے۔ جنگ کی۔ جوانمردی اور شجاعت دکھائی لیکن اس چھوٹے چھ مہینے کے شیر خوار سے تو کسی کی لڑائی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی امام حسینؑ کی حجت تھی جب آپ نے فرمایا کہ لوگو اگر تمہاری نگاہ میں میں گنہگار ہوں اور تمہارے خیال میں میں مجرم ہوں تو یہ چھ مہینے کا بچہ تو کسی شمار میں نہیں ہے۔ اس کو تو ہر قوم اور ملت کے اصول کے تحت بے قصور سمجھا جائے گا۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم جو پانی اس کو دو گے اس سے میں اپنے لب تر کر لوں گا۔ تو میں اس کو زمین پر لٹائے دیتا ہوں۔ اور ہٹا جاتا ہوں تم خود اس کو پانی پلا دو۔ مجھے نہیں معلوم کیا مصلحت تھی۔ مگر وہ حصولِ حکومت کی لڑائی والی بات اس واقعہ سے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ حصولِ اقتدار کی جنگوں میں بچوں کو پیاسا تڑپانے اور ان کو قتل کرنے کی کوئی روایت نہیں ہے عزیزو یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ آدمی ایک مرتبہ گناہ کے راستے میں قدم رکھتا ہے تو پھر وہ اس میں

راسخ ہوتا چلا جاتا ہے جس طرح ایک نیکی دوسری نیکی کو ممکن بناتی ہے۔ اسی طرح ایک گناہ دوسرے زبردست گناہ کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ انسانیت سوز حرکتیں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ تو کربلا میں علی اصغر کے واقعہ سے کہ دو راستے صاف ہو گئے ایک طرف تو انسانیت اور الہٰیت کا علم تھا اور دوسری طرف بہائم صفت اور انسانیت کو قتل کرنے والے لوگ تھے ذرا اس لمحہ کو سوچ کر پانی کا سوال ہو رہا ہے۔ اکثر فوج اشقیا کے لوگ منہ پھیر پھیر کر رونے لگے۔ انسان کا قلب کتنا ہی بدلا جائے اس کو کتنا ہی پتھر بنا دیا جائے پھر بھی انسانیت کی کچھ کچھ رمق اس میں رہتی ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر عمر سعد نے حرملا کی طرف دیکھا اور کہا "اقطع کلام الحسینؑ" اس لئے کہ علی اصغر کی وجہ سے تو تمام فوج میں انقلاب آیا جا رہا ہے۔ حرملا کا تیر چلا اور بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہو گیا۔ یہ اتنا اچانک اور غیر متوقع واقعہ تھا کہ امام حسینؑ تردد کے عالم میں سات مرتبہ آگے بڑھے اور پیچھے ہٹے اور رضاً بقضائہ کہتے رہے۔ قصد کرتے تھے کہ علی اصغر کی لاش کو خیمے میں لے جائیں مگر پھر کچھ سوچ کر پیچھے پلٹتے تھے۔ "اشد حب اللہ" کے معیار پہ بے اختیار آپ کی زبان سے نکلا "انا للہ وانا الیہ راجعون" مگر معصوم سے فطری محبت کے باعث متردد تھے۔ اس سے قبل مولا علی اکبر کی لاش کو اور دیگر اعزا اور احباب کی لاشوں کو تو خیموں میں لے گئے صرف دو آدمیوں کی لاشوں کو نہیں لے گئے تھے۔ ایک حضرت قاسمؑ کی لاش کو کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی تھی۔ اور دوسرے حضرت عباسؑ کی لاش کو وہ ان کی وصیت تھی۔ کیونکہ ان کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اگر سکینہ کو پانی نہ لا کر دے سکے تو خیمہ میں کیا منہ دکھائیں۔ شاید امام حسینؑ نے بھی یہی سوچا کہ علی اصغرؑ کی ماں سے وعدہ کر کے

لیا تھا کہ اس کو پانی پلاؤں گا۔ اگر انھوں نے یہی پوچھ لیا کہ بچے کو پانی ملا
یا نہیں تو میں کیا جواب دوں گا۔ چنانچہ حسینؑ نے ذوالفقار سے ایک ننھی سی قبر کھود
کے بچے کو دفن کر دیا۔ مگر دشمن کو تو گنتی کرنی تھی۔ انھوں نے قبر کھود کر بچے کا سر کاٹ
کر قیدیوں کے ساتھ کر دیا۔

دسویں مجلس

پاک ہے وہ اللہ جو ہمارے خیال سے۔ ہمارے قیاس سے ہمارے گمان
اور ہمارے وہم سے بالاتر ہے۔

"اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم　　　واز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم"

جو کچھ بھی تیرے لیے کہا گیا جو کچھ ہم نے سنا جو کچھ ہم نے پڑھا تو اس سے برتر ہے
ہمارا خیال اور ہمارا قیاس وہاں تک پہونچ ہی نہیں سکتا۔ اور خود اللہ تعالیٰ نے
فرمایا ہے کہ وہ پاک ہے۔ ان تمام چیزوں سے جس سے کہ انسان اس کی
وصف کرتا ہے

اور ہمارا درود ہو محمد مصطفےٰ پر جن کی شان یہ تھی کہ ایک طرف تو یہ فرمایا کہ جس
نے مجھ کو دیکھا اس نے حق کو دیکھا۔ اور دوسری طرف اس عجز کا اعتراف کیا کہ اللہ ہم
نے تجھے نہیں پہچانا جو تجھ کو پہچاننے کا حق ہے۔

اور ہمارا اسلام ہو اس بندۂ مومن پر جس نے اپنے یقین کو اس طرح ظاہر
کیا کہ اگر وہ سب پردے اٹھا دیئے جائیں جو اللہ اور بندہ کے درمیان ہیں تو بھی علیؑ
کے ایمان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوگا۔ اور آج سلام ہو ہمارا اس امام پر جس
نے چند ساعتوں کے اندر عشقِ الٰہی، رضائے الٰہی، توکل، تسلیم اور قربِ الٰہی کی تمام
منزلیں طے کرلیں۔

امام جعفر صادقؑ نے امامؑ کے مختلف درجات کا ذکر یوں فرمایا ہے کہ ایمان
کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی زبان سے اقرار کرے۔ خدا کا اور اس کے رسولؐ کا۔ یہ

درجہ وہ ہے کہ انسان ملّتِ اسلامیہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ مسلمان بن جاتا ہے لیکن مومن نہیں بنتا۔ جیسا کہ کلامِ پاک میں بدوؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ تو اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے اسلام لائے ہو سا نھوں نے قانون کو تسلیم کر لیا ہے۔ مگر ایمان ابھی ان کے دلوں میں نہیں اترا ہے۔ یہ زبانی اقرار کی صورت۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ اور نبوت کا پورا عقیدہ نہ ہو یعنی جو توحید اور نبوت کے شرائط اور آداب ہیں۔ وہ پورے نہ جانتا ہو لیکن کچھ جانتا ہے اور تھوڑا عمل بھی کرتا ہے تو یہ دوسرا درجہ ہے۔ پھر منزل یہ آتی ہے کہ آدمی توحید اور نبوت کے پورے آداب و شرائط بھی جانتا ہے۔ اور اس پر عمل بھی اللہ کے حکم کے مطابق جہاں تک وہ کر سکتا ہے کرتا ہے۔ یعنی عمل صالح کرتا ہے۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔ اس سے آگے یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسولؐ پر ایمان لایا عمل صالح کیا۔ اور اس سے اس کو علم حاصل ہوا وہ علم کہ جو شرح صدر کرتا ہے جس سے سینہ کھلتا ہے اور قلب منور ہوتا ہے یہ مومن کا درجہ ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایمان لانا عمل کرنا اور پھر علم حاصل کرنا یہ ترتیب ہے۔ تو یہ سمجھ لیجئے کہ ایمان ہمیشہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ ایمان جاننے کو نہیں کہتے۔ ماننے کو کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اللہ کو جانو بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کو مانو۔ اللہ کو ہم جان نہیں سکتے۔ اس کو تو اس کے ولی بھی جاننے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اللہ کا رسولؐ جس سے زیادہ کوئی قرب نہیں رکھتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ "ما عرفناک حق معرفتک" کہ ہم تیری معرفت نہیں کر سکے جو معرفت کا حق تھا۔

علم الیقین کے ساتھ آتا ہے۔ ایمان ماننے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہ غیب پر ہوتا ہے۔ اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ آپ کو سفر درپیش ہے تو آپ کوئی Guide Map۔ کوئی نقشہ کوئی کتاب تلاش کرتے ہیں جس سے آپ

جہاں جانا چاہتے ہیں وہ معلوم ہو۔ یا کسی ایسے قابلِ اعتماد آدمی کو تلاش کرتے ہیں جو خود کئی مرتبہ اس راستہ پر سفر کر چکا ہو۔ تو گویا آپ نے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے کسی کتاب کو چھانٹا اور کسی آدمی کو چھانٹا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے کسی کتاب یا کسی آدمی پر بھروسہ کیا۔ اور یہ درجہ ہے ایمان کا۔ بات شروع ہوتی ہے آدمی سے۔ پہلے کسی آدمی پر بھروسہ ہوتا ہے پھر کسی کتاب پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے تو جبرئیلِ امین کو آسمان سے اترتے نہیں دیکھا۔ ہم کو تو اس شخص نے جس کو لوگ صادق اور امین کہتے ہیں۔ یہ بتایا کہ یہ اللہ کا کلام جبرئیل آسمان سے لائے ہیں اور ہم نے یہ بات مان لی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کا صرف کام یہ تھا کہ وہ اللہ کا کلام ہم تک پہنچا دیں اور بس۔ وہ یہ تو سمجھیں کہ جو الفاظ ہم نے سنے وہ محمد مصطفیٰؐ کے منہ سے سنے۔ انھوں نے یہ باتیں کہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو جب تک سب سے پہلے اللہ کے رسولؐ پر ایمان نہیں ہوگا تو اللہ کے دین اور اس کی کتاب پر کیسے ایمان ہوگا۔

تو آپ نے اپنے سفر کے لئے اس آدمی سے گفتگو کی جو کئی مرتبہ سفر کر چکا ہے۔ اس نے آپ کو سفر کے متعلق باتیں بتائیں۔ اور وہ باتیں اب تک آپ کے لئے غیب ہیں آپ کے محسوسات اور مشاہدہ میں نہیں آئی ہیں۔ مگر جب قابلِ اعتماد شخص سے آپ سن رہے ہیں تو یہ سب غیب کی باتیں ہیں ایمان کی بدولت شہود میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بھی کہتا چلوں کہ دنیا میں آپ کو جتنے بھی دین ملیں گے۔ وہاں آپ کو ایک کتاب اور ایک شخص A person and a book ضرور ملے گا۔ دین یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگوں نے مل کر ایک قرارداد منظور کر لی۔ اور وہ دین ہو گیا۔ بلکہ ایک کتاب ہوتی ہے۔ اور ایک شخص ہوتا ہے۔ اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ دین بھی جاری رہتا ہے۔ اور وہ کتاب بھی۔ نہ وہ کتاب ختم ہوتی ہے نہ وہ شخص ختم ہوتا ہے۔ اس شخص کی

حقیقت کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے۔ کچھ بے بصیرت لوگ کتاب پر ہی بہت زور دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مقصد جو تھا۔ وہ محض کتاب کا پہنچانا تھا۔ حضور اکرم تو بس آئے ہی اس لئے تھے کہ کتاب ہم تک پہنچا دیں۔ ایسے لوگ کبھی کبھی یہ بھی کہتے ہیں کہ بس ہمارے لئے کتاب کافی ہے۔ لیکن ہم ایسی بات نہیں کہتے ہیں۔ ہم حامل کتاب کو بھی اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کتاب کو۔

دوسری منزل ہے عمل کی۔ جس پر آپ ایمان لائے۔ اس پر آپ نے عمل کیا۔ خود ان منزلوں سے گزرے خود ان راستوں سے گزرے اور مشاہدہ کیا یعنی ایمان کے بعد عمل کی منزل ہے۔ دین کے سلسلہ میں عمل کا مطلب یہ ہے کہ معاملات میں۔ اخلاق میں جو کچھ بھی تعلیم آپ کے معلم نے دی۔ اور جو کچھ بھی ہدایتیں آپ کے ہادی نے دیں۔ آپ زندگی کے تمام شعبوں میں ان کو جاری رکھیں عبادت کا جہاں تک تعلق ہے تو دین میں کچھ rituals ہوتے ہیں۔ عبادات کے طریقے ہوتے ہیں۔ اور دین میں اعتقادات ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ دین میں تجربہ ہوتا ہے۔ اور جب تجربہ ہوتا ہے اسی وقت عمل اپنے مقصد کو پہونچتا ہے۔ ورنہ محض رسم پوری کرنا یا اعتقادات کو دہرا دینا اس سے عمل حقیقی طور پر پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے نماز کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ بندہ کا اللہ سے ملنا ہے تو جب تک contact پیدا نہ ہو وہ تجربہ حاصل نہ ہو اس وقت تک ہماری رسوم مقصد تک نہیں پہونچتیں اور جب وہ contact ہو جاتا ہے اس وقت وہ عمل بن جاتا ہے۔ اور زندگی کا تجربہ بن جاتا ہے۔

تیسری منزل علم کی ہے۔ جب آپ نے عمل کر لیا۔ تجربہ کر لیا تو اس سے آپ کو علم حاصل ہوا حضرت علیؑ نے فرمایا کہ علم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو علم مسموع یعنی سنا سنایا علم۔ ایسے علم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ دوسرا علم مطبوع ہوتا ہے۔ جو آپ

کے تجربہ میں آ چکا ہے۔ جو آپ کی زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ جو خود آپ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ وہ علم قابلِ وثوق ہے۔ کسی نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ بڑی عبادت کرتے ہیں تو کبھی آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا بھی۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا تو مجھے ایسا بے وقوف سمجھتا ہے کہ میں بغیر دیکھے ہوئے کسی چیز کی عبادت کروں گا۔ میرے لئے تو اگر تمام پردے درمیان سے ہٹا دیئے جائیں تب بھی میرے یقین میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہو سکتا۔ تو نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس کو عقل محسوس نہیں کرتا اور اپنی ہستی کے ہر بن مو سے اور اپنے وجود کے ایک ایک ذرہ حس کی شہادت نہیں دیتا اس کی عبادت کر سکتا ہے۔ یہ ہے علم کا درجہ یہاں عقل سے کام ضرور لیا جاتا ہے کتاب کو اور آدمی کو چھانٹتے ہیں۔ اور جب عقل نے یہاں تک رہنمائی کی تو اس آدمی کی بات سمجھی جائے اور اس کتاب سے سیکھا جائے۔ عمل کے ذریعہ باتیں تجربے میں آ جائیں تو علم حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ علم جو انسان کے تجربے سے پیدا نہیں ہوتا وہ غیر معتبر ہے اور وہ علم آدمی سے الگ ہے۔ قرآن پاک میں علم کی بہت سی قسمیں بتائی گئی ہیں۔ ایک علم یہودی علماء کا بتایا گیا ہے کہ ان کا علم تو ایسا ہے جیسے کسی چارپایہ جانور پر کتابوں کا بوجھ ہو۔ ایک علم وہ ہے جو نور ہے۔ جو آدمی کی ہدایت کرتا ہے اور اس کی ہستی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس کی سیرت personality کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

ان تین منزلوں کے بعد یقین کا درجہ آتا ہے۔ ایمان کی ضد کفر ہے۔ یقین کی ضد شک ہے۔ ایمان اور کفر کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس رہبر کو مانا یا نہیں۔ اگر مانا تو ایمان لائے اور نہ مانا تو کفر اختیار کیا۔ اور اگر آپ کے علم میں تھوڑی کمی باقی ہے تو شک کی منزل ہے۔ امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ یقین کا درجہ صدیقین کا درجہ ہے۔ اولیا کا درجہ ہے۔ اس کے مختلف مدارج ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد رضا کا درجہ ہے توکل کا درجہ ہے تسلیم کا درجہ ہے۔ اور اس کے بعد تفویض کا درجہ ہے۔

عزیزانِ گرامی چونکہ ان درجوں کا ذکر ہم اسی راستہ کے سالک اور رہبر کے ذریعے کر رہے ہیں تو دیکھیں کربلا میں یہ کیسے پورے ہوتے ہیں۔ طوسی علیہ الرحمۃ جو اس روایت کے بڑے عالم ہیں فرماتے ہیں کہ انسان کی فطرتِ اولیٰ اس طرح سے سمجھو کہ اللہ تعالیٰ اس کو عدم سے وجود میں لایا۔ قرآن مجید میں ہے مٹی کے خلاصہ سے پیدا ہوا۔ علقہ بنا، مضغہ بنا، ہڈیاں بنیں۔ گوشت بنا اور پھر پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو خلق کیا، اس کے اعضا کو درست کیا۔ ان میں تناسب پیدا کیا پھر ہم نے اسے وجدان عطا کیا۔ حواس عطا کئے۔ شعور عطا کیا، عقل عطا کی اور ہم نے اس صورت میں ترتیب دی جو ہم چاہتے تھے۔ Personality یعنی صورت اور سیرت۔ اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ اس نے سب کو فرداً فرداً پیدا کیا۔ اور Individuality دی۔ صورت اور سیرت دونوں میں جدا جدا۔ اور جس صورت پر ہم نے چاہا اس کو پیدا کیا۔ اس کے بعد طوسی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اللہ نے انسان کو آگاہی دی یعنی حواس دیئے۔ بچہ دیکھتا ہے آوازوں کو سنتا ہے یہ آگاہی وہ ہے جس پر اس کے علم کی بنیاد رکھی۔ یعنی اس کو وجود میں لایا۔ آگاہی دی۔ پھر تیسری بات یہ کہ ہم نے اس کو قدرت دی۔ یعنی اس میں طاقت آئی حرکت کرنے لگا۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اس میں ارادہ پیدا کیا یعنی وہ چاہے تو کہیں جانے چاہے تو نہ جائے جو چاہے کرے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ بندہ کو وجود ملا۔ آگاہی ملی۔ قدرت ملی اور ارادہ ملا۔ اب ذرا غور کیجئے اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ پر۔ یہی وہ چار باتیں ہیں جو صفات ثبوتیہ کہی جاتی ہیں۔ اسماء الٰہی اور افعال تو وہ ہیں جن میں تضاد بھی ہیں۔ یعنی اللہ اگر رحم کرتا ہے تو غضب بھی نازل کرتا ہے۔ لیکن یہ چار صفات ثبوتیہ وہ ہیں جن میں تضاد ناممکن ہے۔ یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ موجود ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ معدوم ہے۔ اس میں قدرت ہے اور قدرت نہیں ہے۔ وہ عالم ہے اور بے علم ہے۔ یعنی یہ صفات وہ ہیں جن کا ہم اثبات

کرتے ہیں اور ان کے تضادات کی نفی کرتے ہیں تو آپ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ چار صفات
بندہ میں پیدا ہوئیں۔ اور ان کی جھلکیاں بندے میں فطرتِ اولیٰ ہوئیں۔ اب یہاں سے
طوسی فرماتے ہیں کہ اگر بندہ کو اپنے اللہ کی طرف لوٹنا ہے تو جو چیز سب سے بعد میں عطا
ہوتی ہے یعنی ارادہ تو وہ اس کو سب سے پہلے اللہ کے حوالہ کرنا ہوگا اور اس سے
کہنا ہوگا کہ Thy will not mine جو تو چاہے گا وہ ہوگا۔ میری خواہش کوئی چیز
نہیں۔ جو تیرا قانون ہے اور جو تیرا آئین ہے وہ ہوگا۔ وہ جو انسان کا اپنے اللہ کی طرف
رجوع کرنا ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اپنے ارادے کو اللہ کے حوالے کرنا
ہوگا۔ اس کے حکم کے تابع کرنا ہوگا اور یہیں سے مومن اور کافر کے راستے الگ ہونا شروع
ہو جاتے ہیں۔ اور فرق ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ کافر یہ کہتا ہے کہ میرا یہ پلان ہے۔
یہ ارادہ ہے میں یہ کرنا چاہتا ہوں اور یوں کروں گا۔ مومن کہتا ہے کہ اے اللہ میرا ارادہ تو تیرے
تابع ہے مجھے تو تیری رضا حاصل کرنا ہے۔ جو تو چاہے گا وہ ہوگا۔ کافر نفی ہوا اور ہوس۔ اپنی
خواہشات اور شہوات کا غلام بنا۔ اور طوسی علیہ الرحمۃ اس جگہ بڑی عجیب بات لکھتے ہیں
کہ یہ جنت کا راستہ جو ہے تو جنت کا داروغہ رضوان ہے۔ اور جو جہنم کا راستہ ہے اُس
کے داروغہ کا نام مالک ہے۔ یعنی نفس اور خواہشات کے پیرو جو آ رہے ہیں تو
مالک کے غلام بنے ہوئے آ رہے ہیں۔ مومن کے لئے ارادہ کے بعد رجوع کی منزل
ہے یعنی اپنے آپ کو قدرت کے سپرد کرنا۔ بندہ کہتا ہے کہ یا اللہ میری قدرت کچھ بھی
نہیں ہے بلکہ جو تو کرے گا وہ ہوگا اور میں جو کروں گا وہ تیرے حکم سے کروں گا۔ اور
چونکہ میں تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہا ہوں تو میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس
کامیابی کی صورت کیا ہوگی یہ تو جانتا ہے۔ میرے علم میں نہیں۔ مگر یہ یقین ہے کہ جس طرح
بیج بونے سے پودا اُگتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے۔ اسی طرح اگر میں تجھ پر توکل کرتا ہوں۔
تو میرا عمل ضائع نہیں جائے گا۔ توکل کی سب سے بڑی منزل وہ ہوتی ہے جب آدمی اسباب

سے ہٹ کر مسبب الاسباب کی طرف جاتا ہے۔ عزیز دمیا بلا بھی ایک توکّل کی منزل ہے۔
جس میں کہا گیا ہے کہ جو سب دلیلوں اور reas-on ings کو ایک طرف رکھو اور
مسبب الاسباب کی طرف رجوع کرو۔ ایسے موقع پر جو کافر ہے وہ اپنی قوت پر بھروسہ
کرتا ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ کتنے ہتھیار ہیں۔ کتنی فوج ہے۔ مومن اگر ہے تو اس لئے کہ
ہم عالم اسباب میں ہیں ورنہ فیصلہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جس وقت وہ منزل
آجاتی ہے کہ جس میں اسباب کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف مسبب الاسباب کی طرف نظر
ہوتی ہے۔ تو یہ معرفت کی انتہائی منزل ہے۔ یہ منزل منزلِ حسینؑ ہے کہ مدد کرنے والوں
کو واپس کیا جا رہا ہے۔ دوسرے اسباب سے منہ موڑا جا رہا ہے۔ رُخ مسبب الاسباب
کی طرف ہے۔ اب فیصلہ تاریخ کرے گی اور فیصلہ اللہ تعالیٰ کرے گا کہ حق کس کی طرف ہے
اور باطل کس کی طرف ہے۔ اب فیصلہ انسان کا ضمیر کرے گا۔ یہ توکّل کا درجہ ہے جس کے
متعلق کہا جاتا ہے کہ جس قدر یہ سب چیزیں انسان اللہ کے حوالے کرتا جاتا ہے اللہ اس
کو اپنی طرف سے سب کچھ بخشنا شروع کر دیتا ہے یعنی بندہ کی رضا وہ ہو جاتی ہے۔
جو اللہ کی رضا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی رضا بھی وہ ہو جاتی ہے جو بندہ کی رضا ہو۔ جس وقت بندہ
اپنی قوت سے اور اپنے تمام اسباب سے منہ موڑ کر اپنے مسبب الاسباب کی طرف دیکھتا
ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی اس بندہ کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت
میں بندہ کا درجہ وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کو پورا کرنے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا
ہے کہ جب بندہ میری طرف ایک قدم بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دس قدم بڑھتا ہوں۔
جس سے میں محبت کرنے لگتا ہوں اس کو اپنی راہ میں شہید کرتا ہوں۔ اور جس وقت میں
اس کو شہادت کا درجہ دیتا ہوں تو میں خود اس کا خون بہا بن جاتا ہوں۔ تو یہ توکّل کا درجہ ہے۔
اس کے بعد درجہ ہے علم کا۔ جس وقت بندہ اپنے علم کو علمِ الٰہی میں ضم کر دیتا ہے۔ تو
اس وقت اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس عالم امر کا شناسا ہو جاتا ہے جس کا ذکر پہلے

ہو چکا ہے ۔ عالم امر کا شناسا جب عالم اسباب میں کام کرتا ہے تو وہ بھی عالم اسباب میں اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح دوسرے بندے کرتے ہیں۔ عالم اسباب کی توجہ اور بندشوں سے باہر نہیں جاتے۔ محمد مصطفےٰ جس وقت جنگ کی تیاری کرتے تھے تو اسی طرح کرتے تھے۔ جس طرح دنیا میں دفاعی جنگ کی تیاری کی جاتی ہے۔ جس وقت امام حسینؑ کربلا میں آتے ہیں تو وہ بھی ویسی ہی تیاری کرتے ہیں جیسی دفاعی جنگ میں کی جاتی ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کو طفلی کا عہد پورا کرنا ہے۔ اور انجام سے واقف تھے۔ مگر عالم امر کی شناسائی دوسری چیز ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہے۔ اور جو بندوں سے تعلق ہے وہ دوسرا ہے۔ کربلا میں جو مٹھی بھر آدمی ہیں ان کو منظم کیا جا رہا ہے۔ تربیت دی جا رہی ہے تاکہ بہتر سے بہتر طریقے پر جنگ ہو سکے۔ اس وقت بندہ اپنا فرض پورا کر رہا ہے۔ اس کا علم ہو جاتا ہے علم الٰہی میں۔ اور اسی کے ساتھ کافروں کا راستہ بھی چلتا چلا جا رہا ہے۔ وہاں ان کے کمانڈر کو یہ زعم ہے کہ میں بہت بڑا عقل مند ہوں۔ میں جو چاہوں گا کروں گا مجھ میں قدرت ہے تو یہ تباہی اور ہلاکت کا راستہ بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

آخری منزل یہ ہوتی ہے کہ بندہ اپنے نفس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تفویض الی اللہ یہ درجہ قرب الٰہی کا درجہ ہے۔ اس کو یوں سمجھو جیسے ایک infinite series ہوتی ہیں جس میں عدد چلتے چلے جاتے ہیں اور infinity کے قریب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی کوئی حد نہیں یہ لامتناہی سلسلہ ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ بندہ کا منتہا اللہ تعالیٰ ہے۔ infinity کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام عدد اس کی طرف چل رہے ہیں۔ عددوں میں وہ شامل بھی ہے لیکن عددوں سے بالکل مختلف بھی۔ اس کی جتنی بھی خصوصیات ہیں properties particulars and properties وہ لیکن عدد کی properties اور ہو جاتی ہیں اور properties Infinity کی اور ہو جاتی ہیں

اور تمام جمع تقسیم ضرب سے زیادہ بلند ہو جاتی ہیں۔ اس میں نہ زیادہ کا سوال ہے نہ کم کا سوال ہے لیکن عدد سے تعلق یہ ہے کہ وہ infinity کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں یہاں تک کہ نزدیک پہونچے۔ مگر اس کے آگے اور نزدیکی کا درجہ ہے۔ اس کے آگے اور اور اس کے آگے اور وہی infinity مگر وہاں تک نہیں پہونچ سکتے کیونکہ عبد اور معبود کا فرق ضرور رہے گا۔ قاب قوسین اور ادنیٰ۔ دو کمانوں کا فرق یا اس سے کم لیکن فرق ضرور رہا۔ محمدؐ محمدؐ ہی رہیں گے اور اللہ اللہ ہی رہے گا لیکن محمدؐ اور اللہ علیحدہ نہیں سمجھے جا سکتے۔

تو اب ان باتوں پر نظر رکھتے ہوئے دیکھیے کہ وہ رہبر اللہ تعالیٰ کے راستہ کا کربلا جس کی ایک منزل ہے۔ ظاہر کی نگاہوں میں دشمنوں کا ہجوم ہے۔ قاتل موجود ہیں بڑا انتظام ہو رہا ہے۔ باطن کی نگاہوں سے اگر دیکھو تو نظر آئے گا کہ ایک بندہ اللہ کا ہے اور اس کا معبود ہے۔ اور یہ باطل کی فوجیں جو نظر آرہی ہیں ان کی کیا اصل ہے۔ یہ تو بندہ کا امتحان ہو رہا ہے۔ یہ تو بندہ اور معبود کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بندہ امتحان دے رہا ہے۔ ایک معمل ہے۔ کربلا کا میدان ایک معمل ہے۔ جس کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد کے کچھ تعلقات چل رہے ہیں جس کو وہ عبد جانتا ہے اور اس کا اللہ جانتا ہے۔ یہ رضا کی منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ اللہ پوچھ رہا ہے کہ میرے بندے تو کس کس بات پر راضی ہے۔ اور بندہ بتا رہا ہے کہ میرے مالک اگر تیری مرضی یہ ہے کہ میرے سب انصار شہید ہو جائیں تو مجھے منظور ہے۔ اگر تجھ کو یہ منظور ہے کہ میں ان کی لاشیں قتل گاہ سے اٹھاؤں تو ابھی میری کمر میں اتنی طاقت ہے اور اگر یہ طاقت کم ہوگی تو تو دے گا۔ میرے مالک اگر تیری رضا یہ ہے کہ میری اولاد میرے بھائی سب میرے سامنے شہید ہوں تو مجھے منظور ہے۔ اگر تیری رضا یہ ہے کہ میرا چھ مہینے کا بچہ میرے ہاتھوں پر مارا جاتے

تو میرے مالک تو صبر اور بہت عطا کرنے والا ہے میں یہ بھی برداشت کروں گا۔ اگر تیری رضا یہ ہے کہ میری بہن کی چادر چھین لی جائے۔ اور میرے گھر کی عورتوں کو کوفہ و شام کے بازاروں میں اور درباروں میں تشہیر ہو تو یہ بھی منظور ہے۔ جس وقت امام حسینؑ نے مدینہ سے سفر اختیار کیا تھا تو فرمایا تھا کہ ہم اہل بیت محمد کی رضا وہی ہے جو اللہ کی ہے۔ تو یہ رضا کی منزلیں طے ہو رہی ہیں اور توکل الا اللہ کی شان دیکھو کہ کھلے میدان میں خیمے جلا دیئے جائیں۔ چادریں چھین لی جائیں۔ ایک بچی کے کانوں سے بندے چھین لئے جائیں کچھ نہ رہے مگر توکل الا اللہ ان خیموں میں اللہ تعالیٰ کا نور روشن تھا۔ ظالم یہ نہ سمجھے کہ ان خیموں کے جلنے سے اللہ کا نور زمانہ پہ اور روشن ہو جائے گا۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ اس نور کو بجھا دیں۔ مگر وہ نور بجھنے والا نہیں تھا۔ یہ واقعہ جو ایک دیرانے میں ہوا۔ یہ کوفہ میں پہونچے گا۔ یہ شام میں پہونچے گا۔ مدینہ میں پہونچے گا اور تاریخ اس کو محفوظ کرے گی۔ یہ شہادتِ خفی نہیں یہ شہادتِ جلی ہے۔

اب ذرا کربلا میں حسینؑ کی خود سپردگی کی شان اور اس کی تیاری دیکھیئے حسینؑ سے اور یزیدی فوجوں کے کمانڈروں سے گفتگو بھی ہو چکی ہے۔ عمر ابنِ سعد اور گورنر کوفہ سے نامہ و پیام بھی ہو چکا۔ امام حسینؑ نے اپنی terms بھی واضح کر دیئے کہ میں یہاں تک جا سکتا ہوں کہ تمہاری اسلامی مملکت کی حدود سے باہر چلا جاؤں اور یہاں پر آپ نے ایک عجیب فقرہ کہا آپ نے فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ وہاں کے لوگ تم سے بہتر مہمان نوازی کریں گے۔ ادھر یہ ہوا کہ کوفہ سے شمر assignment لے کر آیا کہ اگر عمر ابن سعد ذرا بھی ہچکچائے تو اس کو ہٹا دو اور تم کمانڈ سنبھال لو اور جنگ شروع کر دو۔ ادھر حسینؑ کے چھوٹے سے لشکر اور گھر والوں کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ لڑائی ہونا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کوئی یار و مددگار نہیں آسکتا۔ دشمن کی فوجوں پر فوجیں

گھِر رہی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حبیب ابنِ مظاہر نے کوشش کی تھی کہ قبیلہ بنی اسد کے پاس جائیں مگر راستے مسدود تھے۔ یہ ۹ محرم کا واقعہ ہے۔ امام حسینؑ حضرت عباسؑ سے فرماتے ہیں کہ جاؤ اور ان سے ایک شب کی مہلت مانگ لو۔ مہلت مل گئی رات کا وقت ہے شبِ خون کے خیال سے حضرت عباسؑ پہرہ دے رہے ہیں۔ امام حسینؑ اپنے خیمے میں انصار و اعزا کو بلاتے ہیں اور شمع گل کر کے اندھیرا کر دیتے ہیں۔ اور یقین کی منزل یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے میرے انصار اور یاور ہیں اور جیسے میرے ساتھ دینے والے ہیں ویسے کسی نبی کو بھی نہیں ملے تھے آپ سب کا شکریہ ادا فرماتے ہیں کہ کربلا میں جو کچھ ہونا ہے وہ تو میری جان دینے سے پورا ہو جائے گا۔ یہ لوگ صرف میری جان کے خواہاں ہیں۔ میں نے اپنی بیعت کا قلادہ تمہاری گردن سے اٹھا لیا۔ اس وقت اندھیرا ہے تم لوگ چلے جاؤ کوئی مزاحمت نہیں ہوگی بلکہ جب دشمن کو معلوم ہوگا کہ لوگ مجھ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں تو ان کو اور بھی خوشی ہوگی کہ حسین بے کس اور تنہا رہ گیا ہے۔ تم چلے جاؤ۔ یہ سن کر مسلم ابن عوسجہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ ہم کیسے چلے جائیں۔ ابھی تو ہم نے اپنا حق ہی ادا نہیں کیا۔ زہیر قین فرماتے ہیں کہ اگر یہ دنیا جو فانی ہے اور گزرنے والی ہے اگر یہ جاودانی ہوتی اور میں اس میں ہمیشہ رہنے والا ہوتا تو قسم بخدا میں اس جاودانی زندگی کو بھی آپ کے قدموں پر نثار کر دیتا اس لئے کہ آپ کے قدموں پر مرنا اس جاودانی زندگانی سے بہتر ہے تو امام حسینؑ نے یہ قدریں قائم کیں کہ ایک موت وہ بھی ہوتی ہے جو حیاتِ جاودانی سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ امام حسینؑ نے سب کو دعائیں دیں۔ اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔ ادھر خیموں میں سب اپنے اپنے بیٹے تیار کرنے لگے۔ جناب امّ لیلیٰؑ علی اکبرؑ کو۔ جناب زینبؑ عونؑ و محمدؑ کو لئے بیٹھی ہیں کل امتحان ہے ایمان کا۔ شجاعت کا جرات کا۔ سب کے دل میں ارمان ہوں گے کہ میرے بچے نام پیدا کریں مگر ممکن ہے یہ بھی خیال آتا ہو کہ یہ آخری رات ہے جی بھر کر دیکھ لیں کل یہ صورتیں نظر نہ آئیں گی۔